بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

احمد بن عمرو بن عبد الخالق علمی دنیا میں ابوبکر بزار کے نام سے مشہور ہیں، تیسری صدی ہجری میں عراق کے شہر بصرہ میں پیدا ہوئے تھے، اور ۲۹۲ھ میں شام کے شہر رملہ میں انھوں نے وفات پائی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پورا عالم اسلام حدثنا و أخبرنا کے روح پرور زمزموں سے گونج رہا تھا، اسلامی دنیا کے چپے چپے پر ایسی عجیب وغریب علمی اور تصنیفی وتالیفی سرگرمیاں انجام دی جارہی تھیں، جن کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ اس وقت ہزاروں مربع میل پر مشتمل اسلامی مملکت تشنگان علم ومعرفت کے لیے ایک شہر یا قصبے سے زیادہ نہیں تھی۔ صرف حرمین شریفین، حجاز مقدس یا جزیرۃ العرب نہیں؛ بلکہ عراق وشام، مصر، مغرب، خراسان اور ماوراء النہر وغیرہ کے دور دراز علاقوں اور خطوں میں دشوار گزار اور سنگلاخ راستوں، بے نام ونشان صحراؤں، پہاڑوں اور جنگلی علاقوں کو پامال کرکے ایک شہر سے دوسرے شہر، ایک خطے سے دوسرے خطے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ کے سفر کا لامتناہی سلسلہ جاری تھا۔ تحصیل علم اور طلب کمال کے لیے اس دور کا گویا ہر شخص قافلوں کی صورت میں یا تن تنہا خطرات کی پروا کیے بغیر رواں دواں تھا۔ ان کے عزم وہمت کے سامنے زمین کی طنابیں سمٹ گئی تھیں۔ یہ علم وفضل کے دیوانوں کا وہ مقدس گروہ تھا، جس کے حیرت ناک اور محیر العقول کارناموں اور ناقابل یقین واقعات سے تاریخ کے صفحات لبریز ہیں۔ امیر، غریب، حاکم، محکوم اور چھوٹے بڑے کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔ نہ جانے کتنے دولت مند اور صاحب ثروت تھے، جنھوں نے دولت علم کے حصول کے لیے سونے اور چاندی کے ہزاروں اور لاکھوں سکوں کو قربان کردیا، ایسے غریب اور نادار لوگوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں تھا، جنھوں نے کئی کئی روز کا فاقہ کیا، لیکن تحصیل علم کی ان کی دُھن میں کوئی کمی نہیں آئی، اور نہ جانے کتنی بڑی تعداد ان علماء ومحدثین کی ہے جنھوں نے کم سنی ہی میں اور چہرے پر ریکھ آنے سے پہلے ہی اپنا گھر بار سب کچھ چھوڑ دیا، اور دولت علم سے مالا مال ہوکر لوٹے تو عمر کی اس

منزل میں پہنچ چکے تھے کہ گھر والوں حتی کہ ماں باپ کے لیے ان کا پہچاننا مشکل تھا۔

ابوبکر بزار اسی دور کے نشو ونما پانے والے نابغۂ روزگار محدثین میں تھے، اس دور میں اسلامی علوم کی نشر واشاعت اور خاص طور سے احادیث نبویہ (**علی صاحبها الف الف صلاة وتحية**) کی زبانی اور سینہ بہ سینہ نقل وروایت کے علاوہ، ان کی تدوین اور تصنیف وتالیف کا بازار گرم تھا۔ ابوبکر بزار نے احادیث مبارکہ کا ایک یادگار مجموعہ تصنیف کیا، جس نے ان کے نام کو علمی دنیا میں زندہ جاوید کردیا۔ ان کی کتاب کا نام **البحر الزخار** ہے، جو **المسند المعلل** کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔ **المسند المعلل** کا مطلب یہ ہے کہ اس کتاب میں مذکور حدیثوں کی سندوں میں اگر کوئی علت پائی جاتی ہے، تو اس کو بیان کرنے کا انھوں نے اہتمام برتا ہے۔

....

سند اس امت کا طغرائے امتیاز ہے، اور یہ اس کی ایسی خصوصیت ہے جس میں دنیا کی کوئی قوم اس کی سہیم وشریک نہیں ہے۔ سند راویوں کے اس سلسلے کو کہتے ہیں، جو حدیث کے متن تک پہنچاتا ہے۔ سند کو اسلامی علوم میں بہت اہمیت حاصل ہے، اور امت مسلمہ نے عہد نبوی سے لے کر آج تک اس کی اہمیت کو برقرار رکھا ہے، باوجودیکہ احادیث نبویہ اور آثار صحابہ وتابعین اپنی سندوں کے ساتھ ہزاروں سال پہلے کتابوں اور دواوین میں مدوّن ہوچکی ہیں، لیکن امت کے علماء ومحدثین نے کسی دور میں اس کی تحصیل اور اشاعت سے چشم پوشی اور تغافل سے کام نہیں لیا ہے، اور مرور زمانہ کے باوجود اس سلسلے کو باقی اور برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

اسناد وروایت کے ساتھ اس دلچسپی کا بہترین مظاہرہ سرزمین عرب سے دور ہندوستان کے ایک دور افتادہ علاقے اشاعت العلوم اکل کوا (مہاراشٹر) میں دیکھنے میں آیا، جہاں ۱۹/نومبر ۲۰۱۷ء یکشنبہ سے لے کر ۲۳/نومبر ۲۰۱۷ء پنج شنبہ تک **دورة الحديث النبوي** کے نام سے اپنی نوعیت کا منفرد پانچ روزہ پروگرام منعقد کیا گیا، جس میں ہندوستان کے اطراف واکناف کے علاوہ بلاد عرب، جنوبی افریقہ اور یورپ کے متعدد ممالک کے تشنگان علم حدیث اور کئی ایک محدثین ومجیزین شریک ہوئے، اس پانچ روزہ تقریب کی متعدد مجلسوں میں ترمذی شریف مکمل، شمائل ترمذی، اور شیخ سعید سنبل کے ''رسالۃ الاوائل'' کی قرأت اور خواندگی ہوئی۔ اس تقریب سعید کے انعقاد کا مقصد یہ تھا کہ جو اساتذہ ومدرسین مدارس میں حدیث شریف کا درس دیتے ہیں اور اسناد وروایت سے دلچسپی رکھتے ہیں،

ان کے لیے ہند وبیرون ہند کے ان مشہور اہل علم کی طرف سے اجازت حدیث کا موقع فراہم کردیا جائے جو اسناد وروایت میں عالی اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اس کے لیے اشاعت العلوم اکل کوا کے ارباب انتظام وانصرام نے اس طرح کے تمام بزرگوں کا انتخاب کرکے ان کی خدمت میں دعوت نامے بھیجے اوران سے تشریف آوری کی درخواست کی۔ ہندوستان کے اہم اداروں دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مشہور اساتذۂ حدیث کے ساتھ ساتھ اور بھی متعدد معمّر بزرگوں کو مدعو کیا، دیوبند، سہارنپور اور لکھنؤ وغیرہ کے حضرات تو اپنی شدید مصروفیات کی وجہ سے شریک نہیں ہوسکے، لیکن دوسری نمایاں اور قابل ذکر شخصیات میں جگر گوشۂ محدث جلیل سرپرست ''المآثر'' خال محترم حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی مدظلہ العالی کے علاوہ بہار سے حضرت مولانا سعید الرحمٰن مظہری (عمر ۱۲۰ر سال) مولانا ثناء اللہ صاحب (عمر تقریباً ۱۰۰ر سال) مولانا محمد زاہد مدراسی، مولانا طلحہ منیار اور مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی صاحبان ہندوستان سے اور بلاد عرب سے شیخ حامد اکرم بخاری، شیخ صفوان داودی اور دیگر بہت سے اہل علم کی اس میں تشریف آوری ہوئی، اوران کے ثبت شدہ دستخط سے اس دورے میں شرکت کرنے والے طلبگاران حدیث نبوی کو اجازت نامے تفویض کیے گئے۔ اپنی نوعیت کے اس منفرد اور کامیاب پروگرام کے انعقاد کے لیے جامعہ اشاعت العلوم اکل کوا کے بانی ومعمار خادم قرآن کریم حضرت مولانا غلام محمد وستانوی، ان کے صاحبزادگان جناب مولانا سعید احمد ومولانا حذیفہ وستانوی اور جناب مولوی محمد اویس وستانوی صاحبان اوران کے دیگر رفقاء نے کافی دنوں سے جو محنت اور جدوجہد صرف کی ہے، اس کے لیے وہ حضرات قابل مبارک باد ہیں، اور خدا سے دعا ہے کہ ان کی ان مساعیٔ جمیلہ ومبارکہ کو اپنے فضل وکرم سے قبول فرمائے۔

....

اس پروگرام کا ایک اہم حصہ **كشف الأستار عن زوائد البزار على الكتب الستة** کا رسم اجرا تھا، ہم نے اس مضمون کے شروع میں امام ابوبکر بزار کی جس البحر الزخار کا ذکر کیا ہے، اسی کے زوائد کو آٹھویں ونویں صدی ہجری کے مشہور محدث علامہ نورالدین ہیثمی نے فقہی ابواب کے تحت مرتب کیا تھا، اس کتاب کے بارے میں تفصیلی گفتگو آئندہ شمارے میں ان شاء اللہ شائع کی جائے گی۔

(۶ ربیع الاول ۱۴۳۹ھ = ۲۶ر نومبر ۲۰۱۷ء مکی منزل، مالیگاؤں- ناسک- مہاراشٹر)

ماخوذ: از تفسیر عزیزی (مسلسل)

تفسیر سورۃ البروج

دوسرا قصہ ملکِ یمن کا:

دوسرا قصہ اصحابِ خندق کا ملکِ یمن کے شہر نجران میں واقع ہوا تھا، ایک مسلمان (حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل مقدس کا متبع کہ اس وقت اسلام وہی تھا) ایک آدمی کے ہاں نوکر ہوا، وہ انتہائی دیانتدار اور فرماں بردار تھا، ہر وقت مالک کے دروازے کے باہر بیٹھا رہتا کہ جس کام کا حکم ہو فوراً بجالا سکے، یہ مسلمان انجیل مقدس کا حافظ تھا، ہر وقت انجیل کی تلاوت کرتا رہتا تھا، جس کا یہ نوکر تھا اس کی ایک بیٹی تھی اس نے یہ دیکھا کہ جب یہ انجیل پڑھتا ہے تو ایک نورِ عظیم اس کے سینے سے نکلتا ہے اور پورے عالم میں پھیل جاتا ہے، لڑکی نے یہ بات اپنے والد کو بتائی چنانچہ والد نے ایک رات چھپ کر دروازے کی دراز سے دیکھا تو اس کو بھی یہ منظر صاف دکھائی دیا، اب وہ اس نوکر کے پیچھے پڑ گیا کہ بتاؤ تم کیا پڑھتے ہو، جس کی یہ تاثیر ہے۔

وہ مسلمان وہاں کے کافر بادشاہ اور عیسائیت دشمن سرداروں کے ڈر سے اس راز کو چھپاتا تھا، مگر جب اس کے مالک کا اصرار حد سے بڑھ گیا تو بادلِ نخواستہ اس مسلمان نے یہ بھید ظاہر کر دیا، کہ وہ مسلمان ہے اور جو پڑھتا ہے یہ اللہ کا کلام انجیل مقدس ہے، چنانچہ گھر والا اور اس کی بیٹی اسی وقت مسلمان ہو گئے اور انجیل مقدس کی تلاوت میں مشغول ہو گئے، رفتہ رفتہ شہر تک یہ بات پھیلتی چلی گئی اور ستاسی (۸۷) مرد وعورت مسلمان ہو گئے، (اس دور کے لحاظ سے یہ بہت بڑی تعداد تھی۔)

جب اس بات کی خبر اس شہر کے بت پرست بادشاہ یوسف زئی بن نواس حمیری تک پہنچی تو اس نے ان نوے (۹۰) مسلمانوں کو اپنے پاس حاضر کرنے کا حکم دیا، اور ایک خندق کھدوائی، اس میں آگ دہکائی، پھر ان مسلمانوں کو اس خندق کے پاس لے جا کر حکم دیا کہ یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کو چھوڑ دو ورنہ تم سب کو اس آگ میں جھونک دوں گا۔

مسلمانوں کی اس جماعت میں ایک عورت تھی، جس نے دودھ پیتا بچہ اٹھایا ہوا تھا، جب بادشاہ کا یہ حکم آیا تو اس بچے نے بلند آواز سے کہا امی! بسم اللہ اس آگ میں داخل ہو جاؤ اس کا بدلہ

ہمیشہ کی جنت ہے۔

جب ان مظلوموں کو دہکتی خندق میں جھونک دیا گیا تو بادشاہ اپنے بت پرست مصاحبوں کے ساتھ خندق کے کنارے کرسیوں پر بیٹھا ظلم کا یہ نظارہ دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس آگ کے شعلے لپکے اور ان سب ظالموں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور جلا کر بھسم کر دیا۔

یہ قصہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے تھوڑے عرصہ بعد پیش آیا تھا، اس دن سے نجران کے لوگوں نے عیسائیت کو اختیار کر لیا تھا اور آنحضرت ﷺ کے زمانے تک اسی دین پر تھے، چنانچہ نجران کے عیسائیوں کا وفد سید ایہم اور عاقب وغیرہ کی سربراہی میں مدینہ طیبہ آنحضرت ﷺ کی ملاقات کے لیے حاضر ہوا تھا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بحث و گفتگو کی تھی اور انہی کے متعلق آیت مباہلہ نازل ہوئی تھی۔

تیسرا قصہ ملکِ ایران کا:

ایسا ہی ایک قصہ ملک فارس میں بھی واقع ہوا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے فرماتے ہیں کہ مجوسی لوگ بھی ایک پیغمبر اور آسمانی کتاب کے پیروکار تھے، ان کے مذہب میں شراب بدن کے نفع کے لیے اس قدر پینا حلال تھی جو بیہوش نہ کرے، مجوسیت کے بادشاہ نے ایک دن بہت زیادہ شراب پی لی، اور نشے کی حالت میں اپنی بہن سے بدکاری کر بیٹھا، جب ہوش آیا تو اپنے کیے پر بہت نادم ہوا، اور اسی بہن سے تدبیر پوچھی کہ جو دھبہ ہمارے دامن پر لگ گیا اسے کس طرح دور کیا جائے، بہن نے کہا تم بہن کے حلال ہونے کا دعویٰ کر دو اور یہ اعلان کرو کہ حضرت آدم علیہ السلام کی شریعت میں بہن سے نکاح جائز تھا اس لیے میں انہی کے طریقے پر ہوں لہٰذا بہن حلال ہے۔

بادشاہ نے لوگوں کو جمع کر کے اس نئے مسئلے کا اعلان کیا لیکن لوگوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا، پھر بادشاہ نے عورت سے پوچھا تو عورت نے کہا ان کو کوڑے مارنے کی سزا دو، چنانچہ بادشاہ نے ان لوگوں کو کوڑے مروائے مگر لوگ پھر بھی اس مسئلے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے، پھر اس عورت سے کہا کہ کیا کروں لوگ تو نہیں مان رہے، اس نے رائے دی کہ ان کی گردنیں مارنے کا حکم دو، چنانچہ اس نے بہت سوں کی گردنیں اڑا دیں لیکن لوگ تھے کہ کسی صورت اس مسئلے کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہو رہے تھے، اب اس نے پھر اس عورت سے تدبیر پوچھی تو اس نے کہا کہ ان کا ایک ہی علاج ہے کہ خندقیں کھدواؤ اور ان سب کو مجبور کرو کہ یا یہ مسئلہ قبول کریں ورنہ آگ میں جھونک دیے جائیں گے۔

چنانچہ اس نے خندقیں کھدوائیں ان میں آگ دہکائی اور حکم دیا جو اس مسئلے کا انکار کرے اس کو آگ کی خندق میں پھینک دو۔ چنانچہ اس مسئلے کی پاداش میں بے شمار لوگوں کو جلتی خندقوں میں پھینک دیا گیا اور قدرتِ الٰہی سے عین اسی وقت آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں نے اس بادشاہ کو حواریوں سمیت جلا کر راکھ کر دیا، تب سے ایرانیوں میں بہن سے نکاح اور آگ کی پرستش شروع ہوگئی۔

چوتھا قصہ ملکِ حبشہ کا:

تفسیر زاہدی میں منقول ہے کہ بنی اسرائیل کے زمانے میں مسلمانوں (عیسائی موحّدین) کا ایک شہر تھا، اس میں قحط بہت شدید پڑا جس سے گھبرا کر وہ تمام مسلمان قریبی ملک حبشہ میں ہجرت کر گئے، جب بہت بڑی تعداد میں یہ لوگ وہاں پہنچے تو وہاں کے لوگوں نے جو بت پرست تھے اپنے بادشاہ سے کہا کہ ان لوگوں کی وجہ سے یہاں بھی غلے کی کمی ہو جائے گی اور قحط پڑنے کا اندیشہ ہے، اس پر بادشاہ نے شہر کے دروازے کے باہر ایک خندق کھدوائی اور آگ سے اس کو بھر دیا، پھر ایک بہت بڑا بت ہاتھی کی شکل کا وہاں لا کر کھڑا کیا اور حکم دیا کہ باہر سے آئے ہوئے ان اجنبی لوگوں کو یہاں حاضر کرواور ان سے کہو کہ اس بُت کو سجدہ کریں، جو انکار کرے اس کو آگ کی خندق میں پھینک دو، چنانچہ وہ لوگ حاضر کیے گئے اور ان سے بت کو سجدہ کرنے کا مطالبہ کیا گیا، مگر وہ توحید کے علمبردار سب آگ میں جل گئے لیکن کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جس نے جان کی خاطر بت کو سجدہ کر لینا گوارہ کیا ہو۔

ان مسلمانوں میں اتفاق سے ایک مسکین عورت لائی گئی جس نے ایک دودھ پیتا بچہ گود میں اٹھا رکھا تھا، جب اس سے کہنے لگے کہ اس بت کو سجدہ کرو تو اس نے صاف انکار کر دیا، بادشاہ جو اس وقت موجود تھا عورت کے انکار پر غضبناک ہوا اور حکم دیا اس سے بچہ چھین کر آگ میں پھینک دو، ظالموں نے اس معصوم کو اپنی ماں سے چھین کر دہکتی ہوئی خندق میں پھینک دیا جس پر عورت بے چینی سے تڑپ اٹھی، تب بچے نے آگ کے اندر سے آواز دی: امی! بالکل نہ ڈریں بے دھڑک اس آگ میں کود جائیں حقیقت میں یہ نار نہیں گلزار ہے۔

عورت نے بے ساختہ اللہ کے سامنے دعاء کے لیے ہاتھ پھیلا دیے، بس اتنا کہا الٰہی تو دیکھ رہا ہے، تیرے سامنے یہ سب کچھ ہو رہا ہے، بیان کرنے کی ضرورت نہیں، اتنا کہنا تھا کہ آگ کے شعلے خندق سے کود کر باہر آ گئے اور یہ شعلے چالیس گز اونچے تھے اور قنات کی طرح ان سب کافروں کو گھیرے میں لے لیا پھر سب کو جلا کر بھسم کر ڈالا۔

جب ان چار قصوں کی طرف اجمالی اشارہ کر چکے جن کا حاصل یہ ہے کہ ان ظالموں کی تدبیر انہی پر الٹ گئی اور فی الفور دنیا میں ہی ان سے ظلم کا بدلہ لے لیا گیا، تو اب اس فوری بدلے کی جو کہ خلافِ عادت ہے وجہ بیان فرماتے ہیں کہ خلاف عادت فوری بدلہ ان سے کیوں لیا گیا، چنانچہ فرمایا:

وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ ۝

اوران سے بدلا نہ لیتے تھے مگر اسی بات کا کہ وہ یقین لائے اللہ پر

صیغۂ مستقبل میں نکتہ:

مستقبل کا صیغہ یہاں اس وجہ سے لائے کہ کفار ان سے زمانۂ مستقبل میں ایمان چھڑانا چاہتے تھے، ایمان پر ثابت قدم رہنے کی وجہ سے ان کو اذیتیں پہنچاتے تھے، ماضی کے ایمان کو ترک کرانے کے لیے عذاب نہیں دیتے تھے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان کافروں کی مسلمانوں سے دشمنی صرف ایمان کی وجہ سے تھی، لہٰذا ایمان سے ان کی عداوت تھی، ان کفار کے علاوہ دوسرے کفار بھی مسلمانوں کو اذیتیں دیتے ہیں اور دیتے رہے ہیں، اس کے باوجود وہ سالہا سال تک زندہ سلامت رہے، ان سے انتقام نہ لیا گیا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کی مسلمانوں کے ساتھ عداوت صرف ایمان کی وجہ سے نہ تھی، بلکہ اس کے ساتھ اقتدار و غلبہ اور مال و دولت حاصل کرنے کی طمع بھی اس کے ساتھ ملی ہوئی تھی، مگر یہ کفار خالص ایمان کے دشمن تھے، حالانکہ وہی ایمان صحیح تھا، کیونکہ جس ذات پر ایمان تھا وہ مندرجہ ذیل صفات سے متصف ہے۔

الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝ الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط

جو زبردست ہے تعریفوں والا، جس کا راج ہے آسمانوں میں اور زمین میں

تین صفات بیان کی گئی ہیں، وہ اللہ غالب ہے، سب خوبیوں پر سراہا گیا ہے، آسمانوں اور زمینوں میں اسی کی بادشاہت ہے۔

ان تین صفات میں سے ہر صفت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اسی پر ایمان لانا چاہیے، کیونکہ وہ اپنے سب ماسوا پر غالب کسی کی عزت اس کی عزت کے برابر نہیں، لہٰذا اس پر ایمان لانا بھی عزت و افتخار کا سبب ہے۔

اور جب وہ محمود ہے تو زبان سے، دل سے اس کا شکر بجالانا واجب اور ایمان کا اظہار لازم ہوا۔

جب زمین وآسمان کی بادشاہت اسی کے لیے ہوئی تو اس کے دشمنوں سے ڈرنا بھی جائز نہیں رہا۔

یہ تینوں صفات جس طرح ایمان کے اظہار کا باعث ہوئیں اسی طرح دشمنوں سے جلد انتقام لینے کا بھی تقاضا کرتی ہیں، اس لیے کہ دشمنوں سے بدلہ لینا عزت اور نہ لینا ذلت ہے، محمودیت کا تقاضا بھی دشمنوں سے انتقام لینا ہے کہ دشمنوں سے بدلہ نہ لینا قابل مدح بات نہیں، ہاں معاف کردینا اور بات ہے مگر کافر کو معاف کرنا جائز نہیں ہے، بادشاہت کا تقاضا بھی انتقام ہے ورنہ دشمن دلیر ہوجائیں گے اور کاروبارِ سلطنت میں خلل واقع ہوسکتا ہے، اگر کوئی بادشاہ ان صفات کے باوجود بدلہ لینا چھوڑ دے تو ضرور رعایا کے حال سے بے خبر ہے کہ دشمنوں کی دشمنی اور دوستوں کی دوستی سے بے خبر ہے اور خدائے بالا و برتر بے خبری کے عیب سے پاک ہے اس لیے کہ:

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ ○

اور اللہ کے سامنے ہے ہر چیز

یعنی اللہ ہر چیز سے خبردار ہے، جب کافروں نے ایمان والوں سے ایمان کی وجہ سے عداوت کی اور اللہ تعالیٰ کے انتقام سے غافل ہوئے تو گویا اللہ عزوجل کی عزت، بادشاہت، محمودیت، اور خبرداری سے انکار کیا، سو اِن وجوہات کی بنا پر اللہ کی حکمت جلد انتقام کا تقاضا کرتی ہے چنانچہ خندق والوں کے قصوں میں اسی کا ظہور ہوا۔

جب ایک جزی اور خاص فرد میں دلیل صحیح ہوئی تو اس پر کلی کا قیاس کرنا درست ہوا، چنانچہ فرماتے ہیں:

اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ

تحقیق جو دین سے بچلائے ایمان والے مردوں کو اور عورتوں کو

یعنی ایمان کے ساتھ عداوت کی وجہ سے ستایا، مؤمن مردوں کو اور ایمان والی عورتوں کو، عورتوں کا ایمان مردوں کے ایمان کے مقابلے میں اگرچہ ضعیف ہے کہ ان میں ہوا و ہوس کا غلبہ ہوتا ہے مگر یہ کمی دوسری طرف سے پوری ہوجاتی ہے کہ عورتیں عاجز و بے کس ہیں مدافعت و مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتیں۔

ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِO

پھر توبہ نہ کی تو ان کے لیے عذاب ہے دوزخ کا اور اُن کے لیے عذاب ہے آگ لگنے کا

یعنی فرصت و مہلت ملنے کے باوجود انھوں نے اس ظلم سے توبہ نہ کی اور اسی شغل میں مر گئے، تو ان کے لیے عذاب ہے، اگر یہ توبہ کر لیتے تو حقوق العباد کے لحاظ سے تو ان سے باز پُرس ہوتی، مگر ان کو جو عذاب ہوتا اس میں اتنی شدت نہ ہوتی کیونکہ ایمان سے نفرت و عداوت کے گناہ اور حق اللہ کے ضائع کرنے کے الزام سے چھوٹ جاتے۔

قاتل کی توبہ مقبول ہے:

اسی آیت سے استدلال کیا گیا ہے کہ مسلمان کو عمداً قتل کرنے والا توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول ہے، لیکن اس استدال میں تھوڑی سی بحث ہے، کیونکہ مسلمان کا قتلِ عمد اگر کفر کی حالت میں ہوا ہے تو ایمان لانے کے بعد بالا جماع وہ معاف ہو گیا، اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔ اور اس آیت میں کافر ہی مراد ہیں جو ایمان کی وجہ سے مسلمانوں کو مارتے تھے۔ (یعنی مسلمان مسلمان کو قتل کر دے تو اس کی توبہ کا یہاں ذکر نہیں ہے)

فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ: ان کے لیے دوزخ کا عذاب ہے جس میں طرح طرح کی تکالیف، سزائیں اور دکھ ہیں۔

عذاب حریق سے کیا مراد ہے:

وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ: دوسرے ظالموں کے علاوہ ان کے لیے خاص طور پر جلن کا عذاب ہے جس میں ان کا تن من گرفتار ہوگا، جس طرح انھوں نے مسلمانوں پر جور و جفا کر کے ان کے دلوں کو جلایا تھا۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ''عَذَابُ الْحَرِيْقِ'' سے قبر کا عذاب مراد ہے یہ جہنم کے عذاب سے پہلے قبر میں ان کو پہنچے گا۔

بعض نے اس سے خندق کی وہ آگ جس میں یہ کافر لوگ جل گئے تھے مراد لی ہے۔

جب ان ظالموں کا حال بیان ہوا جو ایمان والوں کو ایذائیں دیتے تھے تو سننے والے کو رنج وصدمے میں اس بات کا اشتیاق پیدا ہوا کہ معلوم نہیں ان مظلوموں کو آخرت میں کیا بدلہ عطا ہوا جن کی

جانیں ایمان کی وجہ سے برباد کردی گئیں، سواس انتظار واشتیاق کو دور کرنے کے لیے نئے سرے سے ایمان والوں کا حال بیان کرنا پڑا۔ اور جب یہ ایک نئی بات ہے، سامع کی تسکین کے لیے لائی گئی ہے، مقصود اصلی کے طور پر اس جگہ نہیں لائی گئی، اس واسطے حرفِ عطف کو چھوڑ دیا اور فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ

بیشک جو لوگ یقین لائے اور کیں انھوں نے بھلائیاں اُن کے لیے باغ ہیں

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: یعنی جو ایمان لائے، اور اس پر ثابت قدم رہے ان ظالموں کی ایذا و تکالیف کے باوجود انھوں نے صبر کیا۔

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: اور نیک کام کیے، کہ نیک کام ایسے وقت میں بہت بڑی پونجی ہے جیسے مصیبت پر صبر کرنا، اللہ کے فیصلے پر راضی رہنا اور ساری مخلوق سے منھ موڑ کر اللہ کی طرف ہی رجوع کرنا۔

لَهُمْ جَنّٰتٌ: ان کے لیے دنیا کی ان مصیبتوں کے مقابلے میں باغ ملیں گے، سو دنیا کی تکالیف تو ان کے حق میں ایسی ہیں جیسے کسی کو اس کے محبوب کے سامنے محبوب کے ساتھ محبت کی وجہ سے ایذاء دیں، یہ ایذاء تو اس کے لیے عین راحت ہوگی۔

تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ط

جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں

وہ طرح طرح کی نہریں: شہد، دودھ، شراب اور پانی کی ہوں گی، یہ اس خون و پسینے کا بدلہ ہے جو کافروں کے ظلم کے بسبب بہا تھا۔

ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِیْرُ o

یہ ہے بڑی مراد ملنی

یہ بڑی مراد ہے، اس لیے کہ دنیا کی مرادیں فنا ہونے والی ہیں اور یہ باقی رہنے والی ہے، کبھی فنا نہیں ہوگی، اور یہ بھی ہے کہ دنیا کے اندر مقاصد حاصل ہو جانے کی صورت میں بھی محبوب حقیقی کی رضا مندی مشکوک ہے، یقینی نہیں ہے، لیکن آخرت کی ان لذتوں میں اس کی رضا قطعی اور یقینی ہے۔

(جاری ہے)

الازہار المربوعہ
(مسلسل)

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

میں نے اعلام میں لکھا تھا:

ثانیاً:- علامہ موصوف نے حدیث ابوالصہباء کے ان الفاظ **ان الناس قد استعجلوا فی شیئ کانت لھم فیہ أناۃ فلو أمضیناہ علیھم** (یعنی لوگوں نے ایسی چیز میں جلد بازی کر ڈالی جس میں ان کو دیر کرنا چاہیے تھی، پس کاش ہم اس کو ان پر نافذ کر دیتے) کو نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ الفاظ گویا صراحۃً دلالت کرتے ہیں کہ تین طلاقیں مجموعی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک حرام نہ تھیں بلکہ جائز تھیں، اس لیے انھوں نے ان کو نافذ کر دیا۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کے سامنے یہی تقریر کر کے تین طلاقوں کے واقع ہوجانے کا حکم وفتویٰ دیا اور اس تقریر سے گویا صراحۃً ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ثلث مجموع کو جائز سمجھ کر ایسا کیا ہے، تو کیا وجہ ہے کہ صحابہ میں سے ایک متنفس نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو متنبہ نہ کیا کہ ثلٰث مجموع حرام ہیں، لہٰذا آپ ان کو نافذ تو کیجیے لیکن للہ ایک حرام چیز کو جائز نہ سمجھئے۔ میں حیرت میں ہوں کہ ابن القیم کے دل میں اس اعتراض کا خطرہ باوجود اس کے وضوح وظہور کے کیونکر نہیں پیدا ہوا، اور اگر یہ خطرہ گذرا تو انھوں نے کس طرح یہ جائز رکھا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود، ابن عمر، ابن عباس، ابن عمرو بن العاص، ابو ہریرہ، علی، عثمان، عمران بن حصین وغیرہم رضوان اللہ علیہم اجمعین کے سامنے ایک حرام چیز کو جائز کہا گیا اور ان تمام حضرات نے خاموشی اختیار کی حالانکہ ان حضرات کی شان تو بہت بڑی ہے اس وقت کی عورتیں بھی حضرت فاروق اعظم کو ٹوک دیتی تھیں۔

صاحب آثار لکھتے ہیں:

''مولف کی تحریر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں تضاد وارد ہے کہ ثلاث مجموع حرام ہے

اور تمام صحابہ اس کے قائل ہیں لیکن حضرت عمر اس نص کی خلاف ورزی کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ایک بات بھی صحیح نہیں ہے، نہ تو اس کے لیے کوئی نص ہے، نہ جملہ صحابہ اس کے قائل تھے، نہ حضرت عمر نے کوئی نص کی خلاف ورزی کی''

جواب:- اب تک تو ہم یہی جانتے تھے کہ مجیب اجماع وقیاس ہی کے منکر ہیں، لیکن ان کی یہ تحریر بتارہی ہے کہ وہ حدیث کے بھی منکر ہیں، اس لیے کہ ان کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حرام وہی چیز ہوسکتی ہے جس کی حرمت قرآن مجید میں نصاً وارد ہوئی ہو، یعنی حدیث میں کسی چیز کی حرمت مذکور ہوتو وہ اس کو حرام نہیں مانتے، یہ کھلا ہوا حدیث کا انکار نہیں ہے تو کیا ہے؟ خیر آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟

پھر اس سے زیادہ حسرت وافسوس کی بات یہ ہے کہ اس کے بعد بھی میرے اعتراض کا جواب نہیں ہوا، اس لیے کہ میرا یہ اعتراض ابن القیم پر ہے جو مجیب کو بھی مسلم ہے اور ابن القیم ثلاث مجموع کی حرمت کو منصوص مانتے ہیں اور زادالمعاد میں اس عنوان **حکم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی تحریم طلاق الحائض والنفساء والموطوءۃ فی طهرها وتحریم إیقاع الثلاث جملۃ** کے ماتحت چند نصوص لکھ کر فرماتے ہیں: **فتضمنت هذه النصوص أن المطلقة نوعان مدخول بها وغیر مدخول بها وکلاهما لا یجوز تطلیقها ثلاثاً مجموعة.** یعنی یہ نصوص اس بات پر مشتمل ہیں کہ مطلقہ کی دوقسمیں ہیں ایک مدخولہ اور ایک غیر مدخولہ اور دونوں کو مجموعی تین طلاقیں دینا ناجائز ہے، اور اس کے علاوہ متعدد مقامات میں جمع ثلاث کو انھوں نے حرام اور حدیث نسائی کی بنا پر کتاب اللہ کے ساتھ کھیل کرنا لکھا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ابن القیم نے جن پر میرا اعتراض ہے، جمع ثلاث کو نصوص سے حرام تسلیم کیا ہے، اور ان نصوص کو زاد المعاد میں ذکر کیا ہے، لہذا مجیب کا یہ کہنا کہ ''اس کے لیے کوئی نص نہیں ہے'' صریح غلط بیانی اور ابن القیم کی تکذیب ہے، اب اہلحدیث ہی حضرات بتائیں کہ ابن القیم جس بات کو نص سے ثابت مانتے ہیں اس کی نسبت یہ کہہ دیا جائے کہ اس کے لیے کوئی نص نہیں ہے، تو یہ ان کی تردید وتکذیب ہے یا میرے اعتراض کا جواب؟

اگر مجیب فرمائیں کہ میں ابن القیم کی وکالت نہیں کر رہا ہوں بلکہ اپنی طرف سے یا بنارسی کی

طرف سے جواب دے رہا ہوں، تو عرض ہے کہ یہ اعتراضات تو ابن القیم پر ہیں جیسا کہ آپ نے خود ص ۱۳۳ میں تسلیم کیا ہے، پھر آپ کو اپنی طرف سے یا بنارسی کی طرف سے جواب دینے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ نیز اگر آپ کو ابن القیم کی وکالت منظور نہ تھی تو اس تطویل لاطائل سے کیا حاصل تھا، صرف اتنا لکھ کر ختم کر دینا چاہیے تھا کہ یہ سارے اعتراضات ابن القیم کے اقوال پر ہیں اور ہم کو ان کے اقوال سے اتفاق نہیں ہے نہ ہم ابن القیم کے مقلد ہیں، اس لیے ہم ان اعتراضات کے جواب کے ذمہ دار نہیں ہیں۔

علاوہ بریں اگر مجیب صاحب ابن القیم کی وکالت کے لیے آمادہ نہیں ہیں تو پہلے صاف صاف لکھیں کہ ابن القیم کی تحقیق غلط ہے اور پھر ان کے دلائل کا ایک ایک کر کے جواب دیں اس کے بعد کچھ فرمائیں تو اس کی داد دی جائے۔

اس گذارش کے بعد میں مجیب سے پوچھتا ہوں کہ میری تحریر کے کس لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ثلاث مجموع کی حرمت قرآن مجید میں نصاً وارد ہے؟ اسی طرح یہ کس لفظ سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام صحابہ اس کے قائل ہیں؟ مہربانی کر کے میری تحریر سے ان دونوں باتوں کو ثابت کیجئے ورنہ غلط بیانی سے توبہ کیجئے۔ کیا ثلاث مجموع کی حرمت کسی حدیث میں وارد ہوئی ہو اور تمام نہیں بلکہ بعض ہی صحابہ اس کے قائل ہوں تو ابن القیم پر میرا اعتراض نہیں پڑتا، اگر نہیں تو کیوں؟

صاحب آثار فرماتے ہیں:

''نیز جن صحابہ کے بارے میں مولف کا یہ خیال ہے کہ یہ لوگ ثلاث مجموع کے حرام ہونے کے قائل تھے، یہ محض خیال ہی خیال ہے حقیقت سے اس کو دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں'' (آثار ص ۱۳۹)

اور اس سے پہلے یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ:

''ان (صحابہ) میں سے ایک کے متعلق بھی بسند صحیح مولف کیا ان کی ساری جماعت یہ نہیں ثابت کر سکتی کہ حضرت فاروق اعظم کے خطبہ میں وہ موجود تھے'' (آثار ص ۱۳۹)

جواب:- مجیب کی پہلی بات پر حافظہ نباشد والی مثل صادق آتی ہے، ناظرین کو یاد ہوگا کہ آثار ص ۷ میں غرائب الفرقان کے حوالہ سے لکھ چکے ہیں کہ ''حضرت عمر، عثمان، علی، ابن مسعود، ابن عباس، ابن عمر، عمران بن حصین، ابوموسی اشعری، ابوداؤد اور حذیفہ رضی اللہ عنہم اجمعین ایک ساتھ تین طلاقوں کے

دینے کوحرام کہتے ہیں'' ناظرین آثار ص ے کی اس عبارت کوخود آثار میں پڑھ کر اندازہ لگائیں کہ مجیب صاحب غلط بیانی میں کتنے مشاق واقع ہوئے، یعنی میں نے جن صحابہ کے نام یہاں لکھے ہیں ان میں سے دو کو چھوڑ کر باقی سب کی نسبت وہ خود لکھ چکے ہیں کہ وہ یکجائی تین طلاقوں کوحرام کہتے ہیں'' اور یہاں اسی بات کوحقیقت سے دور لکھنے لگے۔

باقی رہا مجیب کا یہ مطالبہ کہ'' کیا مولف ان میں سے ہر ایک کے متعلق بسند صحیح یہ ثابت کریں گے؟'' تو اس کا ایک دنداں شکن جواب اس رسالہ کے ص۔۔۔۔ میں دیا جا چکا ہے، دوسرا دنداں شکن جواب یہ ہے کہ حضرت ابن عمر، عمران، ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم کا تین طلاق دینے کو گناہ اور عدوان وغیرہ کہنا تو خود اغاثہ وزاد المعاد وغیرہ میں بسند صحیح موجود ہے اور خود ابن القیم نے ان حضرات کے اقوال نقل کیے ہیں، لہذا اگر آپ ابن القیم کی وکالت کرنا چاہتے ہیں تو کم از کم انھیں صحابہ کو ذہن میں رکھ کر ابن القیم کی طرف سے جواب دیجئے، اس کے بعد اگر آپ مطالبہ کریں گے تو بقیہ صحابہ کی نسبت بھی بسند صحیح ثابت کر دیا جائے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔

اور مجیب کی دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ مجھ سے آپ کا یہ سوال غلط ہے، یہ مطالبہ آپ کو علامہ ابن القیم سے کرنا چاہئے اور اگر وہ اس کو بسند صحیح ثابت نہ کرسکیں تو ان کو اور ان کی جماعت کو مورد طعن بنانا چاہئے، اس لیے کہ ابن القیم ہی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس حکم سے صحابہ کی موافقت کرنے کا ذکر کیا ہے (دیکھو اعلام الموقعین) اور انھیں نے اغاثہ وزاد المعاد میں حضرات مذکورہ بالا کے فتوے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم کے موافق ہیں نقل کیے ہیں، اور انھیں نے اعلام الموقعین میں لکھا ہے: **أجری اللّٰہ علی لسان الخلیفة الراشد والصحابة معه شرعاً وقدراً الزامهم بذٰلک وانفاذه علیهم.** حاصل کلام یہ کہ ابن القیم نے اعلام الموقعین میں یہ تصریح کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم کے وقت ان کے ساتھ صحابہ تھے اور انھوں نے ان کی موافقت کی اور اغاثہ وغیرہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم کے موافق جن حضرات کے فتوے انھوں نے نقل کیے وہ یہی حضرات ہیں، پس آپ ہی کہئے کہ ابن القیم نے جن حضرات کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہونا اور موافقت کرنا بیان کیا ہے اگر وہ یہی حضرات نہیں ہیں تو اور کون حضرات ہیں۔

اس کے بعد انصاف پسند ناظرین سے گذارش ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد **أجیزوهن**

(تین طلاقوں کو نافذ کرو) صاف دلالت کر رہا ہے کہ حکم کے وقت وہ صحابہ موجود تھے جو فتوے دیا کرتے تھے، اس لیے کہ ان کے سوا حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور کس سے یہ کہیں گے۔

۲-اور یہ بھی نا قابل انکار حقیقت ہے کہ حضرات مذکورہ نے تین طلاقوں کو نافذ کیا۔

۳-اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ حضرات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مجلس مشاورت علمی کے ممتاز افراد تھے، اور بہتیری روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے متعدد مسائل میں ان سے مشورہ لیا یا انھوں نے از خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مناظرہ کیا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔ باوجود ان تمام باتوں کے مجیب صاحب ہم سے مطالبہ کرتے ہیں کہ سند صحیح سے ان کی موجودگی ثابت کی جائے، اور ان تمام امور کو ان کی موجودگی کے ثبوت کے لیے ناکافی تصور کرتے ہیں، لیکن جب ہم ان کے دعوائے رجوع عمر رضی اللہ عنہ کے جواب میں کہتے ہیں کہ ''کم از کم جس طرح امضائے ثلاث کا اعلان مجمع میں کیا تھا اسی طرح ندامت کا اعلان بھی ضروری تھا لیکن اس کا کچھ ثبوت نہیں'' تو مجیب لکھتے ہیں کہ ''کیا حضرت عمر نے کسی خلوت میں دیواروں سے گفتگو کی تھی، آخر حضرات صحابہ ہی سے تو کہا ہوگا، ورنہ ہم تک منقول ہو کر پہنچا کیونکر؟'' (آثار ۱۳۲)

اب ناظرین انصاف کریں کہ رجوعِ حضرتِ عمر کا جو باطل دعویٰ کیا جاتا ہے اگر بفرض محال وہ صحیح بھی ہو تو یہ یقینی ہے کہ رجوع میں کسی صحابی نے حضرت عمر کی موافقت نہیں کی، اور اس رجوع کو کسی صحابی سے نقل نہیں کیا، باوجود اس کے اس کا اعلان کرنا تو مجیب کی ایک احتمالی بات سے ثابت ہو گیا اور اس کے لیے سند صحیح کیا سند ضعیف کی بھی ضرورت نہیں ہے، لیکن حضرات مذکورہ بالا کی موجودگی باوجود امور مذکورہ بالا کے بھی ثابت نہیں ہوئی بلکہ اس کے لیے سند صحیح کی ضرورت ہے۔

منصفی دنیا سے ساری اٹھ گئی
دوستو! ایمانداری اٹھ گئی

صاحب آثار لکھتے ہیں:

''یہ بھی غلط ہے کہ عورتیں حضرت عمر کو خطبہ میں ٹوک دیا کرتی تھیں، کیا ہم امید کریں کہ مولف دس بیس ایسی عورتوں کا نام بتائیں گے اور عبارت لکھیں گے الخ''

جواب:- سب سے پہلے ہم مجیب کی سخن فہمی کی داد دیں گے، ماشاء اللہ سخن فہمی آپ پر ختم

ہوگئی! لیکن افسوس صرف یہ ہے کہ جناب کا حافظہ بہت کمزور معلوم ہوتا ہے، اس لیے یہ ''ادبی نکات'' بہت جلد بھول بھی جاتے ہیں، خیر میں اب آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ جناب نے آثار ص۲ میں ''علماء احناف'' اور ص۶۲ میں ''اجلۂ محدثین'' اور ص۴۷ میں ''حنفیہ'' لکھا ہے، لہٰذا میں آپ کے ادبی نکتہ کی قدر کرتے ہوئے آپ کو چیلنج دیتا ہوں، کہ دس بیس علماء احناف دس بیس اجلہ محدثین اور دس بیس حنفیہ کے نام اور کتابوں کی عبارتیں لکھ کر ان کی نسبت جو دعوے کیے ہیں ان کو ثابت کیجیے ورنہ اپنی غلط بیانی اور اپنے اقوال کی غلطی کا اعتراف کیجیے، اس کے بعد میرے قول کو غلط کہنے کا حوصلہ کیجیے گا۔

اس کے بعد آپ نے یہ جو فرمایا ہے کہ ''واقعہ یہ ہے کہ عورتوں کی تو کیا ہستی ہے، اجلۂ صحابہ نہیں ٹوک سکتے تھے، واقعہ ۲و۳ کو پڑھیے'' تو عرض ہے کہ زیادت مہر کے مسئلہ میں ایک عورت کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ٹوک دینا اور حضرت عمر کا اس کی بات کو مان لینا ایسا مشہور واقعہ ہے جس کا انکار ممکن نہیں ہے۔ پس میرے قول کو غلط کہنا دیانت کا خون کرنا ہے اور جب اظہار حق میں ایک عورت کو یہ جرأت حاصل تھی تو اجلۂ صحابہ لا یخافون لومة لائم کے مصداق ہیں۔ ان کا کیا پوچھنا ہے، واقعات صحیحہ شاہد ہیں کہ متعدد مواقع پر صحابہ نے ٹوکا پھر کسی موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو سمجھا دیا اور کسی موقع پر انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سمجھا دیا۔ مجیب صاحب مجنونہ اور حاملہ کے رجم کے باب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا اور متعۃ الحج کے باب میں حضرت ابوموسی رضی اللہ عنہ کا واقعہ مثال کے طور پر پڑھیں، گنجائش نہیں ہے ورنہ ان واقعات کو اور ان کے مثل اور بہت سے واقعات کو تفصیل کے ساتھ لکھا جاتا۔ حاصل یہ کہ مجیب کا یہ کہنا کہ اجلہ صحابہ نہیں ٹوک سکتے تھے صریح غلط بیانی ہے۔ باقی رہا مجیب کا اپنی تمہید پر واقعہ ۲و۳ سے استناد کرنا تو اس کا جواب تقریباً انھیں کے الفاظ میں یہ ہے ''اگر اتفاقیہ ایک مرتبہ حضرت علی یا حضرت حذیفہ نے مخالفت نہیں کی تو یہ کسی طرح قابل استناد نہیں ہے''۔ اب ناظرین کو خیال ہو کہ کیوں قابل استناد نہیں ہے، اس کو پہلے مجیب سے پوچھیں کہ مہر کے مسئلہ میں اس عورت کے ٹوکنے کا واقعہ کیوں قابل استناد نہیں ہے۔ اس کا جو جواب مجیب دیں وہی ہماری طرف سے بھی سمجھ لیں۔

اہل حدیث ناظرین خصوصیت کے ساتھ مجیب کے اس خیانتی انصاف کو غور سے ملاحظہ فرمائیں کہ اسی جگہ بڑھیا کے ٹوکنے کے واقعہ [کو] تو اتفاقی واقعہ اور ناقابل استناد کہتے ہیں، اس لیے کہ اس سے میرا دعوی ثابت ہوتا ہے اور اسی جگہ واقعہ ۲و۳ سے استناد کرتے ہیں، حالانکہ اگر بڑھیا کا واقعہ

اتفاقی واقعہ کہا جاسکتا ہے تو واقعہ ۲و۳ کیوں نہیں اتفاقی واقعہ ہوسکتا اور اس سے کیوں استناد جائز ہوگا۔

علاوہ بریں دعویٰ تو یہ ہے کہ ''اجلۂ صحابہ'' نہیں ٹوک سکتے تھے اور ثبوت میں صرف واقعہ ۲و۳ پیش کیا جاتا ہے، حالانکہ مجیب کا ''ادبی نکتہ'' آپ ابھی سن چکے ہیں اور اس کے رو سے دس بیس اجلۂ صحابہ کا نام اور عبارت کتب پیش کرنا ضروری ہے۔

پھر لطف یہ ہے کہ واقعہ ۲و۳ مجیب کے دعویٰ پر دلالت بھی نہیں کرتا، بلکہ واقعہ ۲ تو ان کے دعوی کے بالکل خلاف ہے، اس لیے کہ مجیب خود تسلیم کرتے ہیں کہ پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنا خیال ظاہر کیا لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی تردید کی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی متابعت کے سوا کوئی چارہ نہ پایا، پس جب حضرت علی پہلے اپنا خیال ظاہر کر چکے تھے تو میرا یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے کہ صحابہ خاموشی اختیار نہیں کرتے تھے۔

اب اگر مجیب کو یہ خیال ہو کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تردید کے بعد بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا وہی خیال تھا جو انھوں نے پہلے ظاہر کیا تھا، بایں ہمہ انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دوبارہ نہیں ٹوکا، تو گذارش ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس سوائے اپنے اجتہاد کے کوئی نص شرعی اس مسئلہ میں نہ تھی کہ اس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کرتے، اب رہا ان کا اجتہاد تو وہ جانتے تھے کہ ایک مجتہد کا اجتہاد دوسرے مجتہد پر حجت نہیں، علاوہ بریں وہ یہ بھی جانتے تھے کہ حضرت عمر مجھ سے زیادہ اعلم وافقہ اور اجتہاد میں ان کا پایہ مجھ سے بلند ہے۔

پس وہ دوبارہ کس طرح ٹوک سکتے تھے؟ اور اپنی بات پر ان کو کیسے مجبور کر سکتے تھے؟ اس لیے خاموش رہے۔ اب اگر کہیے کہ اسی طرح مسئلہ حرمت ثلث کو بھی سمجھ لیجیے تو میں عرض کروں گا کہ حرمت ثلث کو اس مسئلہ پر قیاس کرنا غلط ہے، اس لیے کہ اولاً حرمت ثلث پر نص شرعی موجود ہے اور وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کی جاسکتی تھی، برخلاف مسئلہ مذکورہ کے کہ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے موافق کوئی نص نہ تھی۔

ثانیاً:- مسئلہ مذکورہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے خیال کے موافق فتویٰ دینے کا حکم نہیں دیا تھا، برخلاف مسئلہ طلاق کے کہ اس میں حکم دیا تھا۔

ثالثاً:- مسئلہ مذکورہ میں ایک بار حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنا خیال ظاہر کر چکے تھے، برخلاف مسئلہ

طلاق کے کہ اس میں ایک بار بھی کسی نے اپنا خیال ظاہر نہ کیا، اور اگر خواہ مخواہ آپ دونوں مسئلوں کی حیثیت یکساں بھی قرار دیں تو جس طرح مسئلہ خیار میں آپ نے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس وقت تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے تسلیم کرلی، لیکن جب وہ خود خلیفہ ہوئے اپنی سابق رائے کے مطابق فتویٰ دیا، اسی طرح مسئلہ طلاق میں ثابت کیجیے کہ جن صحابہ کے سامنے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے امضائے ثلاث کی تمہیدی تقریر کی تھی اور امضا فرمایا تھا اور امضا کا حکم دیا تھا انھوں نے اس وقت تو ان کی موافقت کی، لیکن ان کے بعد ان کی رائے سے مخالفت ظاہر کی اور یہ کہا کہ ہم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ان کی متابعت کرلی تھی ورنہ ہماری وہ ذاتی رائے نہیں تھی، آپ تنہا نہیں بلکہ جس جس سے جی چاہے مدد لے کر اس کو ثابت کیجیے۔

علاوہ بریں واقعہ ۲ و ۳ میں میرے دعویٰ کے خلاف کوئی بات نہیں ہے، اس لیے کہ میرے دعویٰ کا حاصل تو یہ ہے کہ ''صحابہ کے سامنے کسی حرام کو جائز قرار دیا جائے تو ان کا خاموش رہنا ناممکن ہے'' اور واقعہ ۲ و ۳ میں کسی حرام چیز کو جائز قرار دینا مذکور نہیں ہے، لہذا اس کو میرے مقابلہ پیش کرنا نادانی ہے۔ میں حیران ہوں کہ مجیب کو میں کون کون سی بات سمجھاؤں، ان بیچاروں کو یہ بھی خبر نہیں ہے کہ ایک غیر منصوص مسئلہ میں کسی مجتہد کے اجتہاد پر اس کو نہ ٹوکنا اسی طرح کسی جائز فعل سے دفع مفسدہ کی وجہ سے منع کرنے پر خاموش رہنا جائز وممکن ہو تو اس سے کسی حرام چیز کو جائز قرار دینے میں خاموش رہنے کا جواز وامکان کسی طرح ثابت نہیں ہوتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک رائے اجتہادی جو کسی نص کے خلاف نہ تھی سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مخالفت نہ کی بلکہ متابعت کی اور حذیفہ کے واقعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو ایک جائز فعل سے دفع مفسدہ ورفع فتنہ کے لیے روکا تو انھوں نے مزاحمت نہیں کی۔ اس سے میرے دعویٰ پر کیا اثر پڑا؟ کیا اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ جس طرح ان واقعات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ وحذیفہ رضی اللہ عنہ خاموش رہ گئے تھے اسی طرح کسی حرام کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ (معاذ اللہ) جائز قرار دیتے تو بھی یہ حضرات یا ان کے امثال خاموش رہ جاتے **نعوذ باللہ من سوء الفهم وسوء العقيدة.**

(جاری ہے)

علم کی فضیلت اور تحصیل علم کے آداب
(وعظ حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ)

[حضرت مولانا الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ نہایت قیمتی بیان مدرسہ عربیہ بیت المعارف الہ آباد میں ہوا تھا، اور ایک کتابچہ کی شکل میں شائع کیا گیا تھا، ہم نے اسی کتابچہ سے اس کو لے کر یہاں نقل کیا ہے، اس پر ناشر کا نام ''عبدالمجیب ناظم مدرسہ ہذا'' تحریر ہے، اور اس کی تمہید میں لکھا ہوا ہے:

''مورخہ ۳؍شعبان المعظم ۱۳۹۸ھ یوم یکشنبہ کو محدث دوراں ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی دامت برکاتہم کا ورود مسعود ہمارے مدرسہ میں ہوا اور ہم لوگوں کی خواہش اور درخواست پر حضرت مولانا دامت برکاتہم نے باوجود ضعف وعلالت کے نماز مغرب کی امامت بھی فرمائی اور بعد نماز مغرب بیان بھی فرمایا، جس میں طلبہ اور اساتذہ کے علاوہ اچھی خاصی تعداد میں اہل شہر بھی شریک تھے، جو ہم سبھی کے لیے بالخصوص طلبہ کے لیے، بہت ہی مفید اور کارآمد ہے، اس لیے یہاں اس کو بعینہٖ درج کیا جاتا ہے''۔]

اَلْحَمْدُ لله، نَحْمَدُهٗ، وَنَسْتَعِيْنُهٗ، وَنَسْتَغْفِرُهٗ، وَنُؤْمِنُ بِهٖ، وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ، وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا، وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلا مُضِلَّ لَهٗ، وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلا هَادِيَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهٗ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا. أمابعد!

اس وقت مجھ سے یہ کہا گیا کہ نماز کے بعد طلبہ کے سامنے کچھ باتیں کہی جائیں، تو خصوصیت کے ساتھ طلبہ کی جماعت ہی کو نگاہ میں رکھ کر اس وقت چند باتیں کہنا چاہتا ہوں۔

علم کی فضیلت:

علم بہت بڑی دولت ہے، جس کی نسبت کہا جاتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دولت میں سے جتنا ہی خرچ کیجیے اتنا ہی بڑھتی ہے۔ دوسری دولتیں تو ایسی ہیں جو خرچ کرنے سے کم ہوتی ہیں؛ مگر علم ایسی دولت ہے کہ خرچ کرنے سے کم نہیں ہوتا؛ بلکہ جتنا خرچ کیا جاتا ہے اتنا ہی بڑھتا ہے، اور یہ ایسی عظیم

الشان چیز ہےاوراس قدر فضل و بڑائی کی چیز ہے کہ سردارانبیاء جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کسی اور چیز کی زیادتی کی دعانہیں فرمائی؛مگرعلم کی زیادتی کے لیےاللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کوحکم ہوا کہ ﴿قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا﴾ (آپ کہیے کہ اے میرے پروردگار میرے علم میں ترقی دے)۔اس سے معلوم ہوا کہ علم کی زیادتی مطلوب ہے،اورصرف عامۃ الناس ہی نہیں ؛ بلکہ حضرات انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام اور جوسردارانبیاء ہیں وہ بھی اس کے محتاج ہیں کہ زیادت علم کی درخواست حق تعالیٰ کے سامنے کریں۔اس لیے طلبہ کو میں بتانا چاہتا ہوں کہ زیادت علم جب اتنی بڑی چیز ہےتو ہم سےاورتم سے بہت کچھ قربانیاں بھی چاہے گا۔امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ ہے،انھوں نے یہ فرمایا ہے کہ علم اپنے میں سےتم کو تھوڑا سا حصہ اس وقت تک نہیں دے گا جب تک تم اپنا کُل اس کو نہ دے دو۔یعنی جب تم اپنا سب کچھ اس پر قربان کردوگےتوعلم اپنے میں سے کچھ حصہ تم کو دے گا؛مگر یہاں عام شکایت ہے کہ جوقربانیاں اس کے لیے چاہئیں وہ ہم پیش نہیں کرتے۔ہم میں آرام طلبی ہے،ہم میں طلب راحت ہے،ہم چاہتے ہیں کہ بہت مشقت نہ اٹھانی پڑے؛اس لیے آپ دیکھیں گے، کہ عموماً طلبہ کا یہ حال ہوگیا ہے کہ رات کو مطالعہ کرکے اپنے امکان اور طاقت بھر جتنا کتاب کا مطلب نکال سکیں نکال کر پھر دوسرے دن استاد کے سامنے کتاب پڑھ کراس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کریں،ایسا بہت کم ہوگیا ہے۔کثرت سے ایسے طلبہ ہیں جومطالعہ نہیں دیکھتے،اور بہت کم ایسے طلبہ ہیں جواس راہ میں قربانی کا جذبہ رکھتے ہوں۔عام طور پر یہ حال ہوگیا ہے کہ اگر کھانے کو اچھا نہ ملےتو مدرسہ چھوڑ دیں،ان کو عیش وراحت کا ساز وسامان نہ ملےتو کسی دوسرے مدرسہ کا رخ کریں گے۔تو یاد رکھو یہ طریقہ بہت غلط ہے،اس سے علم نہیں حاصل ہوسکتا؛اوراس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرو کہ جب تم بہت سی قربانیاں اس کے لیے پیش کروگے،تب تھوڑا سا علم تم کو آوے گا (اور علم ایسی عظیم الشان چیز ہے کہ اس کا تھوڑا بھی دنیا ومافیہا سے بڑھ کر ہے)۔

علم تواضع سے آتا ہے:

میں تم کو بتانا چاہتا ہوں کہ صحیح بخاری میں ہے،حدیث نہیں ہے،مقولہ ہے؛مگر صحیح بخاری میں ہے کہ دوقسم کے لوگوں کو علم نہیں حاصل ہوسکتا،ایک وہ انسان جوشرم کرے،اور دوسرے وہ جو متکبر ہو، اس میں نخوت ہو، اپنے کو بڑا سمجھے؛ اس لیے کہ علم کے لیے ضرورت ہوگی تواضع کی،علم کے لیے ضرورت ہوگی جھکنے کی،علم کے لیے ضرورت ہوگی نیازمندانہ پیش آنے کی؛ لہٰذا جب تم میں بڑائی ہوگی،تو علم تمھارے پاس آنے سے اِباء کرے گا،اورشرم ہوگی تو تم کو طلب اور سوال میں شرم آئے گی،

جو محرومی کا سبب ہوگی۔

سوال کا سلیقہ ہونا چاہئے:

اسی سلسلہ میں یہ بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ: إِنَّمَا شِفَاءُ العِيِّ السُّؤالُ (۱) (جہل اور عجز کا علاج سوال اور پوچھنا ہے)۔آج ہم میں پوچھنے پاچھنے کی عادت بھی مفقود ہوگئی ہے۔طلبہ کو ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے استاد کے سامنے کتاب کی عبارت پڑھی اور استاد نے سر اٹھا کر ایک تقریر کردی، پھر طالب علم کو سمجھ میں آئے یا نہ آئے، وہ کتاب بند کر کے چلا جاتا ہے؛ حالانکہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ جو چیز سمجھ میں نہ آئے اس کو پوچھے۔ پھر پوچھنے کے بارے میں بھی مجھ کو یہ بتانا ہے کہ ہر چیز کا ایک ڈھنگ اور سلیقہ ہوتا ہے، اس ڈھنگ سے وہ چیز حاصل ہوگی۔ سوال اگر سلیقے سے ہوگا تو مفید ہوگا، اور جو سوال بے سلیقہ ہوگا وہ غیر مفید ہوگا۔ بہت سے لوگ سوال کے شائق ہیں، تو میں نے ان کو دیکھا کہ کوئی آدمی مسافر مہمان، ان کو مل جاتا ہے، تو اس کے سامنے سوالات کی بھرمار کردیتے ہیں۔ یہ طریقہ ہماری اسلامی تہذیب اور اسلامی معاشرت کے جو آداب ہیں، اس کے خلاف ہے۔ تحصیل علم کے جو آداب ہیں، اس میں سوال کے متعلق ہم کو یہ ادب سکھایا گیا ہے کہ انسان کو سوال کا موقع تلاش کرنا چاہیے، استاد اور معلم کے نشاط کو دیکھنا چاہیے کہ وہ مطمئن ہے یا نہیں؟ وہ راحت کے ساتھ ہے یا نہیں؟ کسی پریشانی اور عدم نشاط کی حالت میں سوال نہ کرنا چاہیے۔

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنا ایک واقعہ خود بیان کیا ہے، کہ بہت دنوں سے ایک آیت کے بارے میں میرے دل میں ایک سوال پیدا ہو رہا تھا، ایک قسم کی کھٹک تھی اور میں جانتا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کا حل فرما سکتے ہیں؛ مگر میں انتظار کرتا رہا کہ مناسب موقع ملے اور نشاط کی حالت ہو تو ان سے دریافت کروں، اسی انتظار میں سالوں بیت گئے، مجھے اِس وقت اُس مدت کی مقدار یاد نہیں مگر طویل مدت بیان کی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ عرصہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مجھے حج کا اتفاق ہوا اور واپسی میں ایک منزل پر قیام ہوا، تو وہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو رفع حاجت کا تقاضا ہوا، میں نے ان کے لیے ڈھیلے وغیرہ مہیا کیے، پھر آ کر بیٹھ گیا، قضائے حاجت کے بعد ان کے لیے وضو کا پانی لایا، جب وہ وضو سے فارغ ہوئے، تو میں نے محسوس کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نشاط میں ہیں، جس کو آج کل کی زبان میں لوگ کہتے ہیں کہ موڈ میں ہیں، تو اس وقت میں نے وہ سوال ان کے سامنے پیش کیا اور انھوں نے جواب مرحمت فرمایا۔

اس سے معلوم ہوا کہ سوال کا یہ طریقہ ہے، اور جب اس کا اہتمام کیا جاتا تھا تو اسی درجہ کا علم بھی حاصل ہوتا تھا، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا علمی اعتبار سے صحابہ میں جو مقام ہے ظاہر ہے، وہ اسی ادب کا نتیجہ تھا۔

یہی چند باتیں ہیں جو میں طلبہ کو نصیحۃً بتانا چاہتا ہوں، اگر ان کو اختیار کرو گے تو تم کو علم نافع حاصل ہوگا۔

....

اور باقی حضرات جو موجود ہیں ان سے مجھے یہ کہنا ہے کہ ہم میں سے سب لوگ نہ طالب علم ہیں اور نہ سب کے سب طالب علم بن سکتے ہیں؛ لیکن اگر ہم طالب علم کی کفالت کرتے ہیں، ان کی مدد کرتے ہیں، ان کے لیے تحصیل علم کی سہولتیں مہیا کرتے ہیں، تو ہمارا بھی شمار اسی گروہ میں ہو جائے گا۔ پس اگر ہم خود طلب علم نہیں کر سکتے، تو تحصیل علم میں مساعدت تو کر سکتے ہیں، طلبہ کی مدد تو کر سکتے ہیں، ان کے لیے سہولتیں تو مہیا کر سکتے ہیں؟ اگر آپ یہ کریں تو آپ بھی فضیلت میں شریک ہو جائیں گے، اور آپ بھی طالب علموں کی جماعت میں شامل ہو جائیں گے۔ یہ بھی بہت بڑی سعادت ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو بھی مجاہد فی سبیل اللہ قرار دیا ہے جو کسی مجاہد کے لیے سامان جہاد مہیا کرے۔

آپ اپنے اسلاف کی سیرت پڑھیے، ان کے حالات کتابوں کے اندر درج ہیں اور قیامت تک وہ ثابت رہیں گے، ان کو پڑھ کر سبق لیجیے۔

ترمذی کی ایک حدیث میں ہے، غالبًا ابن المدینی فرماتے ہیں کہ میں نے ایک حدیث اپنے استاد سے **عنعنہ** کے ساتھ سنی تھی،- یہ روایت کا ایک طریقہ ہے جس میں عن فلاں عن فلاں سے روایت ہوتی ہے، دوسرا طریقہ **حدَّثَنا** کا ہے، یعنی ہر راوی یہ ذکر کرتا ہے کہ یہ حدیث مجھ سے فلاں نے بیان کیا- تو وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے استاد سے عن فلاں کے طریق سے ایک حدیث سنی تھی، پھر برسوں اس خیال میں رہا کہ کبھی ان سے ملاقات ہو جاتی تو اس حدیث کو ان کی زبان سے لفظ **حدَّثَنا** کے ساتھ سماعت کر لیتا، پھر خود ان ہی کا بیان ہے کہ محض اسی مقصد کے لیے ایک سال میں نے حج کیا اور حج سے میرا اور کوئی مقصد بجز اس کے نہیں تھا کہ وہاں ان سے ملاقات کر کے اس حدیث کو ان سے بصیغۂ حدَّثَنَا سن لوں۔

میرے دوستو! یہ ہے علم، اور یہ ہے علم کے لیے مجاہدہ، اور یہ ہے علم کے لیے قربانی، اور یہی طریقہ ہے علم دین کی تحصیل کا، ہمارے اسلاف نے اسی طریقہ سے علم حاصل کیا ہے، ہم کو بھی انھیں کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

میں افسوس کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ اس وقت لمبی تقریر کے قابل نہیں ہوں، تھکا ہوا ہوں، مریض بھی رہتا ہوں، ضعف بھی ہے، اس لیے انھیں چند کلمات پر اکتفا کرتا ہوں۔

دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق دے، ہمارے طلبہ کے اندر اچھی صلاحیتیں پیدا کر دے، ان میں قربانیوں کا جذبہ پیدا کر دے، اللہ رب العزت ان کو علم کی دولت سے مالا مال کر دے۔

وآخر دعوانا أن الحمد للّٰہ رب العالمین وصلی اللّٰہ تعالی علی خیر خلقه سیدنا محمد وعلی آله وصحبه اجمعین.

نصیحت

اسی موقع پر ارشاد فرمایا کہ ابھی حال میں متعدد مدارس اسلامیہ میں ختم بخاری کے سلسلہ میں حاضری ہوئی، میں نے طلبہ کے حالات کا اندازہ کرتے ہوئے ان کو اس بات کی طرف متوجہ کیا کہ تم جو علم دین حاصل کرنے کے لیے ان مدارس میں آئے ہو، تو سمجھو کہ یہ انبیاء علیہم السلام کی میراث ہے، اس کو حاصل کرنے کے لیے وہی آداب اختیار کرنے ہوں گے جو صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بحیثیت معلم اور مرشد ہونے کے اختیار فرمایا، نبوت کی خصوصیت میں تو کسی کی شرکت نہیں ہوسکتی؛ لیکن چونکہ رسول اللہ ﷺ صحابہ کے معلم اور شیخ ومرشد بھی تھے؛ اس لیے اس حیثیت سے جو آداب آپ کے تعلیم کیے گئے ہیں، ان کو اختیار کرنا ہر تلمیذ ومسترشد کو اپنے معلم ومرشد کے ساتھ اس سے اخذ فیض کے لیے شرط اولیں ہے۔

شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ نے ''عوارف المعارف'' میں شیخ کے لیے جو آداب تحریر فرمائے ہیں، ان کی ابتدا انھیں آداب سے فرمائی ہے جو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے لیے بیان فرمایا ہے، چنانچہ ان آداب کی ابتدا حضرت شیخ نے اس آیت سے فرمائی ہے:

﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ﴾

یہ سورۂ حجرات کی پہلی آیت ہے، اس میں منصب نبوت کے آداب اور حقوق حضرت سید المرسلین ﷺ کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ اے ایمان والو! اللہ اور رسول ﷺ (کی اجازت) سے پہلے تم (کسی قول یا فعل میں) سبقت مت کیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا، جاننے والا ہے۔

اسی سلسلہ میں فرمایا کہ عربی کا مشہور شعر ہے جس کی نسبت بعض لوگ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف کرتے ہیں؛ مگر میرے نزدیک اس نسبت کی تحقیق نہیں، البتہ جس نے بھی یہ شعر کہا ہے نہایت عمدہ مضمون بیان کیا ہے، **وھو ھذا:**

إنَّ المُعَلِّمَ والطبيب كليهما

لا ينصحان إذا هما لم يُكرَما

اصبر لدائک إن جفوت طبيبه

واصبر لجهلک إن جفوت معلماً

یعنی معلم اور طبیب دونوں شاگرد اور مریض کی پوری خیر خواہی اس وقت تک نہیں کر سکتے، جب تک کہ ان کا اکرام واحترام نہیں کیا جائے گا۔ طبیب ومعلم کی توجہ منعطف کرانے کے لیے ان کا ادب واحترام لازم وضروری ہے۔ آگے کہتے ہیں کہ اگر تم طبیب پر جفا کرو گے تو پھر اپنے مرض کو لیے بیٹھے رہو، اسی طرح اگر اپنے معلم پر جفا کرو گے تو اپنے جہل کو لیے بیٹھے رہو۔ یعنی اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حقیقی علم کبھی نہ آوے گا اور ہمیشہ جاہل ہی رہو گے۔

ہمارے جتنے بڑے بڑے علماء ومشائخ ہوئے ہیں، ان سب نے اپنے اساتذہ اور مرشدین کا غایت درجہ ادب واحترام کیا ہے، چنانچہ علامہ خلیل مالکی رحمۃ اللہ علیہ جنھوں نے فقہ مالکی میں ایک کتاب لکھی ہے، جس کا نام **المختصر** ہے، اور اسی پر آج تمام فقہ مالکیہ کا مدار ہے، ان کے حالات میں لکھا ہے کہ اپنے زمانۂ تلمذ میں جس استاد سے علم حاصل کرتے تھے، ایک روز وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ شیخ کسی آدمی کی تلاش میں کہیں تشریف لے گئے ہیں، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ شیخ کے گھر کا پاخانہ بھر گیا ہے، کوئی صاف کرنے والا نہیں؛ اس لیے کسی آدمی کی تلاش میں نکلے ہیں کہ لا کر صاف کرا دیں۔

خلیل مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ سنا تو کہنے لگے کہ اس خدمت کے لیے تو میں موجود ہی ہوں، یہ میرا حق ہے۔ یہ کہہ کر اپنی دونوں آستینیں چڑھا کر جھٹ پٹ اپنے ہاتھوں سے پاخانہ کو صاف کر ڈالا،

جب شیخ واپس آئے تو دیکھا کہ پاخانہ صاف ہو چکا ہے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ خلیل نے اپنے ہاتھوں سے صاف کیا ہے۔ یہ سن کر شیخ کی عجیب حالت ہوگئی اور گریہ طاری ہو گیا اور اسی حال میں حق تعالی سے ان کے حق میں دعا فرمائی کہ یا اللہ! تو اس کو فقیہ بنا دے۔ چنانچہ اسی دعا کی برکت سے شیخ خلیل مالکی کو اللہ نے وہ مقام عطا فرمایا کہ آج فقہ مالکی کا مدار انھیں پر ہے۔

میرے عزیزو! اگر تم اس وقت اپنے زمانۂ تعلُّم میں ایک ساعت کی ذلت کو برداشت کر لو گے، تو ہمیشہ کے لیے تم کو عزت و راحت حاصل ہوگی۔ ہمارے بزرگوں کا یہی طریقہ رہا ہے اور انھوں نے اسی طرح کے کمالات حاصل کیے ہیں، جیسا کہ خلیل مالکی ؒ کا واقعہ نقل کیا گیا، اسی طرح کے صدہا واقعات منقول ہیں، جن میں ہمارے لیے کافی عبرت و نصیحت ہے۔

نیز ارشاد فرمایا کہ:

آج کل ہمارے عربی مدارس کے طلبا بھی بالکل وہی روش اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں جو کالجوں اور اسکولوں کے طلبہ اختیار کرتے ہیں، اور انھیں کے رنگ میں رنگ جانے کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں؛ حالانکہ اِن میں اور اُن میں بہت فرق ہے۔ ہم کو تو اپنے اسلاف کی نقل کرنی چاہئے اور اسی میں ہماری عزت و فلاح اور کامیابی ہے۔ دنیوی تعلیم تو محض دنیا کے حصول کے لیے حاصل کی جاتی ہے، اس کی تحصیل کا جو طریقہ ہوگا، یہ ضروری نہیں کہ علم دین کی تحصیل کا بھی وہی طریقہ ہو، وہاں تو طلبہ اور اساتذہ میں اگر کوئی ربط نہ ہو تو چنداں مضائقہ نہیں؛ لیکن علم دین میں اگر تلامذہ اور اساتذہ میں باہم ارتباط نہ ہوگا، تو یہ فیض سے محرومی کا سبب ہوگا؛ اور میں سمجھتا ہوں کہ دینی انحطاط کا ایک بڑا سبب اس باہمی ارتباط کا فقدان ہے، ظاہر ہے جب طلبہ کا اساتذہ سے کوئی ربط نہ ہوگا، تو ان کی خصوصیات کے حامل کیوں کر ہو سکتے ہیں؟ اور ان کے آداب سے کس طرح متأدِّب ہوں گے؟ اور ان کے اخلاق سے کیسے متخلِّق ہوں گے؟

[ناقل عرض کرتا ہے کہ احقر نے حضرت مولانا اعظمی دامت برکاتہم کی نصائح کو اپنی فہم کے مطابق قلم بند کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان ارشادات عالیہ غالیہ کو اپنا نصب العین بنانے کی توفیق عطا فرمائے اور حضرت مولانا دامت برکاتہم کی ذات گرامی کو صحت و سلامتی کے ساتھ ہمارے سروں پر تا دیر قائم رکھے، اور ان کی توجہات کو ہماری طرف بایں شفقت و عنایت ہمیشہ منعطف رکھے اور ہم کو ان کی قدر دانی نصیب فرمائے۔ آمین ثم آمین]

التصويبات لما في حواشي البخاري من التصحيفات

مسعود احمد الاعظمی

استاذ محترم، پیکر لطف ومحبت حضرت مولانا عبد الجبار صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک بلند پایہ عالم، کہنہ مشق مدرس، تجربہ کار معلم ومربی اور بہت اچھے مصنف ومحقق تھے۔ عمر کا بیشتر حصہ انھوں نے درس وتدریس اور تعلیم وتربیت میں گزارا، اس فن میں ان کو کمال حاصل تھا، اور صرف طلبہ نہیں بلکہ اساتذہ اور مدرسین ان سے تربیت حاصل کرتے تھے، ان سے درس وتدریس کا بھی طریقہ سیکھتے اور نشست وبرخاست اور ادب وشائستگی بھی، وہ اخلاق وکردار کا نمونۂ مجسم تھے، عمر میں حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ سے تین چار برس چھوٹے تھے، اور ان ہی کے تربیت یافتہ اور ان سے کسب فیض کیے ہوئے، اپنے استاذ گرامی قدر کے علم ومعرفت اور فضل وکمال کے ایسے گرویدہ وشیفتہ تھے کہ زمانۂ طالب علمی سے ان کے دامن سے جو وابستہ ہوئے تو زندگی کی آخری سانس تک ان کے آستانۂ علم وفضل سے جدا نہیں ہوئے، اور جب ۱۷/رجب ۱۴۱۴ھ مطابق ۳۱/دسمبر ۱۹۹۳ء کو آپ کی زندگی کا چراغ گل ہوا، تو استاذ ہی کے پہلو میں ان کو سپرد خاک کیا گیا۔

حضرت مولانا عبد الجبار صاحب کی علمی وتصنیفی خدمات میں اہم ترین کارنامہ تصویبات کی تصنیف ہے، یہ کام بلاشبہہ آپ کی دقت نظر اور عقابی نگاہ کا پتہ دیتا ہے، اس کتاب کی تصنیف وترتیب کے دوران ان کو کس قدر دماغ سوزی اور جانکاہی کا سامنا کرنا پڑا ہوگا، اس کا اندازہ اہل علم اس کتاب کو دیکھنے کے بعد ہی کر سکتے ہیں۔

صحیح بخاری کتاب اللہ کے بعد دنیا کی سب سے صحیح کتاب ہے، یہ کتاب جب سے عالم وجود میں آئی ہے، اس وقت سے لے کر آج تک اہل علم کی توجہ کا مرکز رہی ہے، اور اس کی شرح وتوضیح اور الفاظ ومعانی کی تشریح کے لیے اب تک بے شمار کتابیں تصنیف کی جا چکی ہیں، اس کی جو شرحیں لکھی

گئی ہیں، وہ سب طویل اور مفصل، اور کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہیں، جس کی وجہ سے ان سے استفادہ بھی کوئی آسان کام نہیں ہے، اس مشکل کے حل کے لیے مسند وقت محدث ہند حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۲۹۷ھ) نے اس کے حواشی تحریر فرما کر عظیم الشان کارنامہ انجام دیا، مشہور ہے کہ حضرت مولانا سہارنپوری صرف پچیس پاروں کا حاشیہ تحریر فرما سکے تھے، آخر کے پانچ پارے جو باقی رہ گئے تھے، ان کی تکمیل حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۲۹۷ھ) نے کی۔ ان حواشی کی خصوصیت یہ ہے کہ مختصر اور سہل ہونے کے ساتھ متعدد کتابوں کے اندر مذکور متعلقہ مباحث کا عطر کشید کر کے ان میں پیش کر دیا گیا ہے۔

صحیح بخاری کا یہ حاشیہ جب پہلی مرتبہ شائع ہوا تو نہایت صاف ستھرا اور پاکیزہ تھا، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں غلطیاں در آتی گئیں، اور کہیں کہیں تو اس کے معانی اور مفاہیم ہی بالکل الٹ کر رہ گئے، محدث کبیر حضرت علامہ اعظمی علیہ الرحمۃ اس کتاب پر اپنے تأثرات تحریر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فكانت الطبعة الأولىٰ تجلو البصائر، وتقرّ النواظر وكانت الثانية لا تقصر عن الأولىٰ إلا قليلاً، ولكن لما تتابعت الطبعات وأهمل أهل المطابع أمر تصحيح ما ينسخه الخطاط لتقديمه للطبع، ولم يراعوا الدقة في قراء ة البروفات، بل ربما أهملوها رأساً، فجاء النسخ المطبوعة بعد هذا الإهمال وعدم المبالاة محرفة ومصحفة، بل ممسوخة، وأصبحت الإستفادة منها ممتنعة.''

یعنی اس کا پہلا ایڈیشن دیدہ زیب اور جاذب نظر تھا، اور دوسرا ایڈیشن بھی پہلے سے کچھ ہی کم تھا، لیکن جب ایک کے بعد ایک اس کے ایڈیشن نکلتے گئے، اور پریس والے کاتب کے کتابت کیے ہوئے مواد کی تصحیح سے غفلت برتنے لگے، اور پروف ریڈنگ کا خاص اہتمام نہیں کیا، بلکہ کبھی کبھی تو اس کو یکسر نظر انداز کر دیا، تو اس غفلت اور لاپرواہی کے نتیجے میں اس کے مطبوعہ نسخے غلط سلط بلکہ مسخ ہو کر آنے لگے، اور اس سے استفادہ دشوار ہو گیا۔

دو ضخیم جلدوں کے بھرپور حواشی کے اندر واقع ان غلطیوں کا پتہ لگانا، ان کی تہ تک پہنچنا، اور

پھر ان کی تصحیح وترتیب، یہ سب کوئی آسان کام نہیں تھا، اس کے لیے تبحر علمی کے ساتھ باریک بینی، دقیقہ رسی اور ژرف نگاہی کی ضرورت تھی، اور اس سے بھی زیادہ ضرورت تھی استقامت اور ثابت قدمی کی، خدائے علیم وقدیر نے اس کام کے لیے حضرت مولانا عبدالجبار صاحب کا انتخاب کیا، اور انھوں نے تین سال کی سخت محنت، مسلسل جانفشانی اور شبانہ روز عرق ریزی کے بعد اس اہم اور عظیم الشان کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ اس کام کے بارے میں خود ہی تحریر فرماتے ہیں:

"وانی لما كلفت بتدريس صحيح البخاری بفضل اللّٰه ومنه، التزمت مطالعة هذه الحاشية بامعان، وكنت أستفيد منها حسب الحاجة، غير أنه قد أشكلت علي مواضع عديدة من الحاشية وصعب علي حلها."

یعنی اللہ کے فضل وکرم سے جب صحیح بخاری پڑھانے کا مجھ کو مکلّف بنایا گیا، تو میں باریک بینی کے ساتھ اس حاشیہ کا مطالعہ کرنے لگا، اور بقدر ضرورت میں اس سے استفادہ کرنے لگا، مگر یہ کہ متعدد مقامات میرے لیے مشکل ہو گئے، اور ان کو حل کرنا میرے لیے دشوار ہو گیا۔

پھر جب یہ مشکل اور دشواری بکثرت پیش آنے لگی، اور غلطیوں کی کثرت اور زیادتی کا اندازہ ہونے لگا، تو ان غلطیوں کا سراغ لگانے کی دھن سوار ہوئی، جس کے لیے آپ نے اصل کتابوں اور مراجع کی طرف مراجعت فرمائی، فرماتے ہیں:

ولما تكرر هذا راجعت مراجع الحاشية، فتبين لي أن البلاء في اشكال هذه المواضع، هو أخطاء مطبعية، وهي كثيرة جداً، فخطر ببالي أن أجمع هذه الأخطاء وأصوبها بالمقارنة إلى المآخذ، لأني رأيت الكلمات التي وقعت الأخطاء فيها، لايمكن فهمها وحل معانيها، الا لمن له بصر كبير في الحديث، وأماالمبتدي من طلبة الحديث فيصعب عليه ذلك جداً.

جب یہ بار بار ہونے لگا، تو میں نے حاشیہ کے مراجع کی طرف مراجعت کی، تب مجھے

احساس ہوا کہ ان اشکالات کی اصل مصیبت طباعت کی غلطیاں ہیں، جو کہ بہت زیادہ ہیں، اس وقت مجھے خیال ہوا کہ ان غلطیوں کو جمع کردوں اور اصل مآخذ سے مقابلہ کرکے ان کی تصحیح کروں، کیونکہ میں نے محسوس کیا کہ جن الفاظ میں غلطی واقع ہوگئی ہے، ان کو سمجھنا اور ان کے مفہوم تک رسائی حاصل کرنا صرف اسی کے بس کی بات ہے، جس کی حدیث پر گہری نظر ہو، اور حدیث کے مبتدی طلبہ کے لیے تو یہ جوئے شیر لانا ہے۔

آگے حضرت مولانا علیہ الرحمۃ ان غلطیوں کی کیفیت اور شدت پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

فان هذه الأخطاء ليست هي أخطاء ألفاظ فحسب، بل انما هي فوق ذلک في كثير من المواضع: تبديل كلمة بكلمة، ونفي باثبات، ما يجعل الطالب الناشئ حيران لا يدري ما يفعل.

یہ غلطیاں صرف الفاظ کی غلطیاں نہیں ہیں، بلکہ بہت سے مقامات پر اس سے بڑھ کر ہیں، کہیں الفاظ کچھ سے کچھ ہوگئے ہیں، کہیں مثبت کے بجائے منفی ہوگئے ہیں، جس کی وجہ سے طالب علم حیران و پریشان رہ جاتا ہے۔

اس کے بعد مولانا علیہ الرحمۃ نے اس تحریف وتبدیلی کے کچھ نمونے بھی پیش کیے ہیں، مثال کے طور پر جلد اول ص ۳۵۹ پر حاشیہ نمبر ۸ کی سطر نمبر ۵ میں یہ لفظ آیا ہے ”الذي نسج به“ حاشیہ کی یہ عبارت علامہ عینی کی کتاب عمدۃ القاری سے منقول ہے، مولانا عبدالجبار صاحب نے عینی جلد ۴ ص ۳۲۹ کی طرف مراجعت کی، تو اس کے الفاظ اس طرح ملے: ”**الذي لم ينسج به**“ ذرا سی غلطی سے بات کہاں سے کہاں تک جا پہنچی، کہ منفی سے مثبت ہوگیا۔

اسی طرح جلد اول کے ص ۳۶۲ پر حاشیہ نمبر ۸ کی سطر میں یہ الفاظ ہیں: ”**هذا يتعلق بكتمان**“ حضرت مولانا علیہ الرحمۃ نے قدیم نسخہ کی طرف مراجعت فرمائی، تو اس میں یہ الفاظ ملے: ”**هذا لا يتعلق بكتمان**“

مولانا عبدالجبار صاحب نے اپنے دیباچے میں اس قسم کے دس نمونے ذکر کیے ہیں، جن میں سے بیشتر منفی سے مثبت اور مثبت سے منفی ہوگئے ہیں۔

اس قسم کی فاش غلطیوں پر نگاہ پڑنے کے بعد حضرت مولانا کو اس کا شدت سے احساس ہوا، اوران کو درست کرنے کا عزم مصمم کرلیا، اور مراجع ومصادر سے مراجعت کرنے کے بعد ان کو نوٹ کرنا شروع کیا، انھوں نے تدریسی مشغولیات کے باوجود نہایت محنت ومشقت اور جانفشانی سے کام لے کر اس عظیم الشان اور دقت طلب کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

جس وقت مولانا نے اس کام کو ہاتھ لگایا، اس وقت ان کے زیر تدریس صحیح بخاری کی جلد ثانی تھی، اس لیے فطری طور پر اسی جلد سے کام کا آغاز کیا، مولانا اپنے دیباچے میں یوں ارقام فرماتے ہیں:

ولما أني كنت مكلفاً بالتدريس، فلم أكن أجد وقتاً كافياً لهذا العمل، غير أني جعلت أختلس من الأوقات ودأبت على ذلك حتى أتممت تصويبات المجلد الثاني أولاً، حيث هو الذي كان تحت تدريسي، في مدة سنتين بعون الله تعالىٰ وتوفيقه.

چونکہ میرے سپرد درس وتدریس کی ذمہ داری تھی، اس وجہ سے میں اس کام کے لیے زیادہ وقت نہیں دے پاتا تھا، پھر بھی کچھ وقت نکال کر اس کام کو کرتا رہا، یہاں تک کہ میں نے دوسری جلد کی تصویبات پہلے پایۂ تکمیل کو پہنچائی، کیونکہ یہی جلد میرے زیر درس تھی، اس جلد کا کام اللہ کے فضل وکرم سے دوسال کی مدت میں تمام ہوا۔

اس کے بعد پہلی جلد کا کام شروع کیا، اوراس کی تکمیل میں ایک سال کی مدت صرف ہوئی، اس طرح تین سال کے عرصے میں ان دونوں جلدوں کی تصویبات کو انجام دینے کا کارنمایاں کر دکھایا۔ دوسری جلد کے آخر میں اس کام سے فراغت کی تاریخ مولانا نے ۱۸/ربیع الثانی ۱۳۹۹ھ تحریر فرمائی ہے، اورٹھیک گیارہ مہینے بعد ۱۸/ربیع الاول ۱۴۰۰ھ کو پہلی جلد کی ترتیب وتسوید سے فراغت پائی، جیسا کہ اس کے آخر میں مرقوم ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

ذیل میں حضرت مولانا عبدالجبار صاحب کی اس خاموش مگر ٹھوس اور گرانقدر علمی خدمت کے کچھ نمونے نقل کر کے قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

صحیح بخاری کا جو حاشیہ ہے، اس کو تین قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے، ایک تو اوپر نمبر وار ہے،

جس میں احادیث کے معانی ومفاہیم کی توضیح وتشریح ہے۔

دوسرے ''اسماء الرجال'' کا عنوان لگا کر راویوں کے نام کی وضاحت اور نہایت اختصار کے ساتھ ان کا تعارف دیا جاتا ہے۔

تیسرے ''حل اللغات'' کے عنوان سے الفاظ کی لغوی تشریح ہوتی ہے۔

حضرت مولانا عبدالجبار صاحب نے بھی اپنی کتاب میں اس کا اہتمام برتا ہے، آپ کی کتاب پر اچٹتی ہوئی نگاہ بھی ڈالنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسماء الرجال کی کسی غلطی کی تصویب کرتے وقت اس کے سامنے ''اسماء الرجال'' لکھ دیا جاتا ہے، ''حل اللغات'' کی اگر تصحیح ہے، تو اس کے سامنے ''حل لغات'' ذکر کر دیا جاتا ہے، اور اگر معانی حدیث کی تشریح کا حاشیہ ہے، تو اس میں حاشیہ کا نمبر اور سطر نمبر تک درج کر دی گئی ہے۔

اسماء الرجال امام بخاری نے پہلی حدیث جو روایت کی ہے، اس کی سند میں ان کے استاذ ''حمیدی'' ہیں، حاشیے میں حمیدی کی نسبت مذکور ہے: **ولیس ھو أبا عبداللّٰہ محمد بن أبي النصر صرح الحمیدی صاحب الجمع بین الصحیحین.** اس عبارت کا صاف اور سیدھا مطلب یہ ہے کہ سند کے اندر جو حمیدی ہیں، وہ ابوعبداللہ محمد بن ابی نصر نہیں ہیں، **کتاب الجمع بین الصحیحین** کے مصنف حمیدی نے اس کی تصریح کی ہے۔

مولانا عبدالجبار صاحب نے کتابوں سے مراجعت کے بعد اس کی تصحیح اس طرح فرمائی: ''**أبي النصر فتوح الحمیدي**''۔ یعنی اس عبارت میں صرّح کا لفظ غلط ہے، صحیح فتوح ہے۔ اب اس عبارت کا مطلب یہ ہوگا کہ سند کے اندر جو حمیدی ہیں اس سے وہ حمیدی مراد نہیں ہے، جو **کتاب الجمع بین الصحیحین** کے مصنف ہیں، اور جن کا نام **أبو عبداللّٰہ محمد بن أبي النصر فتوح الحمیدی** ہے، نہ یہ کہ **الجمع بین الصحیحین** کے مصنف امام حمیدی نے تصریح کی ہے۔

اصل میں حمیدی کی نسبت سے دو بزرگ مشہور ہوئے ہیں: ایک تو ابوبکر عبداللہ بن الزبیر حمیدی ہیں، جن کی وفات ۲۱۹ھ میں ہوئی ہے اور جو امام بخاری کے شیخ واستاذ ہیں، جن کی کتاب مسند حمیدی مشہور ہے، اور حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق وتعلیق سے دو جلدوں میں مجلس علمی ڈابھیل سے شائع ہوئی ہے، اور دوسرے ابوعبداللہ محمد بن ابی النصر ہیں جو **الجمع بین الصحیحین**

کے مصنف ہیں، اور یہ امام بخاری سے متاخر ہیں اور ان کا سن وفات ۴۸۸ھ ہے۔

....

صفحہ ۱۱ پر امام بخاری نے اپنے استاذ اسحاق بن منصور کی روایت سے حدیث ذکر کی ہے، اسحاق بن منصور کے بارے میں حاشیے میں یہ مذکور ہے: **اسحاق بن منصور أبي بهرام** الخ۔ اس عبارت کی رو سے ابو بہرام، منصور کی کنیت ہو جائے گی۔

استاذ محترم مولانا عبدالجبار صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تصویبات میں اس کی تصحیح اس طرح کی ہے: **اسحاق بن منصور بن بهرام.** یعنی صحیح ابی بہرام نہیں، بلکہ بن بہرام ہے کہ منصور بہرام کے صاحبزادے ہیں۔

....

صفحہ ۱۵ میں مالک بن عبداللہ واقع ہے، مولانا عبدالجبار صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تصحیح کر کے مالک بن انس لکھا۔

صفحہ ۱۶ کے حاشیے میں ابن سیرین کی تاریخ وفات اس طرح مذکور ہے: **مات سنة ١١ هـ** یعنی ۱۱ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

مولانا عبدالجبار صاحب نے اس کی تصحیح کی کہ **مات سنة ١١٠**، یعنی صحیح یہ ہے کہ ۱۱۰ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے۔

....

صفحہ ۲۰ پر حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا نام سعید بن مالک لکھ گیا ہے۔

مولانا عبدالجبار صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تصویبات میں اس کی تصحیح کی کہ سعید بن مالک نہیں بلکہ ان کا نام سعد بن مالک ہے۔

....

صفحہ ۲۵ کے حاشیے میں ہے: **خال هو ابن يزيد الاسكندراني.** مولانا عبدالجبار صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تصحیح کی کہ **خالد هو ابن يزيد الاسكندراني** یعنی صحیح لفظ خال نہیں بلکہ خالد ہے۔

اسی صفحے پر اس کے بعد والی سطر میں ''**سعيد التيمي مولاهم البصري** ''واقع ہے۔

مولانا عبدالجبار صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تصویب اس طرح کی کہ ''سعید اللیثي مولاهم المصري'' ۔یعنی حاشیے میں اس ایک نام میں دو غلطیاں ہوئی ہیں: ایک تو اللیثي کی جگہ پر التیمي ہو گیا ہے، اور دوسری غلطی یہ ہے کہ المصري ہونا چاہئے تھا، اس کے بجائے البصري ہو گیا ہے۔

پھر اسی صفحے پر اس کے بعد ''نعیم بن عبداللّٰہ المدني الوردي'' ہے۔ مولانا عبدالجبار رحمۃ اللہ علیہ نے الوردي کی جگہ العدوي صحیح لکھا ہے۔

اس کے بعد اسی صفحے (۲۵) پر عباد بن تمیم بن یزید الانصاري واقع ہے، مولانا نے اپنی کتاب میں یزید کے بجائے زید لکھا ہے۔

....

صفحہ ۳۰ پر ایک حدیث کی سند میں راوی کا نام شیبان آیا ہے۔ ان کے بارے میں حاشیے میں یہ الفاظ ہیں: شیبان هو عبدالرحمان أبو معاویة النحوي.

مولانا عبدالجبار رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تصویب و تصحیح اس طرح فرمائی: شیبان بن عبدالرحمن أبو معاویة.

غور فرمائیں کہ ذرا سی غلطی سے بات کیا سے کیا ہو جاتی ہے، حاشیے کے الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ شیبان ہی کا نام عبدالرحمٰن بھی ہے، اور ان کی کنیت ابو معاویہ ہے؛ مگر مولانا علیہ الرحمۃ کی تصحیح نے صحیح بات بتا دی کہ شیبان کا نام عبدالرحمٰن نہیں ہے، بلکہ وہ عبدالرحمٰن کے لڑکے ہیں۔ یعنی عبارت میں هو غلط ہے، اس کی جگہ بن ہونا چاہئے۔

....

حل لغات | صفحہ ۲ پر حدیث میں ایک لفظ فغطني ہے، جس کا معنی ہے کہ مجھ کو دبایا، حاشیہ میں اس کی نسبت لکھا ہے: فغطني ماض من التغطیة. یعنی فغطني تغطیۃ باب تفعیل سے فعل ماضی ہے۔

مولانا عبدالجبار صاحب نے تصویبات میں لکھا: ماض من الغط، یعنی فعل ماضی تغطیہ (جو کہ تفعیل کا باب ہے) سے نہیں ہے، بلکہ غط سے ہے۔

....

صفحہ ۳ پر یہ لفظ واقع ہے: النشب بمعنی اللیث۔ یعنی نشب لیث کے معنی میں ہے۔

مولانا نے اس کی تصحیح کی کہ **النشب بمعنیٰ اللُّبث** کہ نشب لُبث کے معنی میں ہے۔ لیث عربی میں شیر کو کہتے ہیں، اور لبث کا مطلب ٹھہرنا ہوتا ہے۔

....

صفحہ ۱۶ پر مذکور ہے: **الفهم من ضرب**. یعنی لفظ فہم ضرب کے باب سے ہے۔

مولانا علیہ الرحمۃ نے اس کی تصویب فرمائی کہ: **الفهم من علم**. یعنی باب ضرب سے نہیں بلکہ باب علم یعنی سمع سے ہے۔

پھر اسی صفحے پر اس کے بعد لفظ **الجماد** ہے۔ مولانا عبدالجبار صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تصحیح میں **الجمار** بنایا۔

....

توضیحی حواشی آخر میں ہم اُن حواشی کی کچھ غلطیوں کی تصحیح کا نمونہ پیش کر کے جو معانی کی توضیح وتشریح کے لیے ہیں، اس مضمون کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔

صفحہ ۴ پر حاشیہ نمبر ۱ کی پہلی سطر میں **في عموم النفي** واقع ہوا ہے۔

مولانا عبدالجبار صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تصویبات میں اس کی تصویب اس طرح کی کہ ''**في عموم النفع**''، یعنی صحیح لفظ النفی نہیں، بلکہ النفع ہے۔

ان دونوں باتوں میں کتنا فرق ہوجاتا ہے، یہ بتانے کی حاجت نہیں ہے۔

....

صفحہ ۱۴ پر حاشیہ نمبر ۲ کی دوسری سطر میں یہ عبارت ہے: **لأن الغالب أن وفاة الأسير تؤدي الى الإضطراب والفتنة**. جس کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ عموماً اسیر (قیدی) کی وفات انتشار اور بدامنی کا سبب بن جاتی ہے۔

مولانا عبدالجبار صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تصحیح کی کہ: ''**أن وفاة الأمير**''، یعنی لفظ اسیر جس کا معنی قیدی ہے، غلط ہے؛ صحیح لفظ امیر ہے، یعنی امیر (حاکم یا گورنر وغیرہ) کی وفات انتشار اور بدامنی کا سبب بن جاتی ہے۔

....

صفحہ ۲۷ پر حاشیہ نمبر ا کی پہلی سطر میں یہ الفاظ ہیں: **لِمَ لا تسـألـون عـن عبـدالـلّٰـه بن مســعـود.** از روئے عربیت اس عبارت کا مطلب یہ ہوگا کہ تم لوگ عبداللہ بن مسعود کے بارے میں کیوں نہیں پوچھتے ہو۔

حالانکہ صحیح عبارت جیسا کہ مولانا عبدالجبار صاحب نے اپنی کتاب میں لکھا ہے یہ ہے کہ: **لم لا تسألون عبداللّٰه بن مسعود.** یعنی تم لوگ عبداللہ بن مسعود سے کیوں نہیں پوچھتے اور دریافت کرتے۔

....

صفحہ ۳۷ پر حاشیہ نمبر ا کی پہلی سطر میں ہے: **ان اهــل الـصـدقة.** جس کا مطلب یہ ہوگا کہ صدقہ والے۔

مولانا عبدالجبار صاحب نے تصویبات میں اس کو لکھا کہ **ان ابـل الـصـدقة.** کہ صحیح **ابـل الصدقة** (صدقہ کے اونٹ) ہے۔

جن حضرات کو اس قسم کے تحقیقی وعلمی کاموں سے واسطہ پڑا ہوگا، وہ اس کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شیخ الحدیث ولی صفت بزرگ حضرت مولانا عبدالجبار صاحب کو اس کتاب کی ترتیب اور تیاری میں کتنی محنت ومشقت اور کس قدر عرق ریزی اور جاں سوزی کرنی پڑی ہوگی، تب جا کر یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا ہوگا، بظاہر دیکھنے میں تو یہ بہت آسان ہے، لیکن اس میں جو پِتّہ ماری اور دماغ سوزی کرنی پڑتی ہے، اس کے لیے کوئی صاحب ہمت وعزیمت انسان ہی خود کو آمادہ کرسکتا ہے، اور بالخصوص جب کہ ایک تصحیح کے لیے نہ جانے ان کو کتنی کتابوں کی ورق گردانی کرنی پڑی ہوگی، اس لیے کہ کوئی بھی تصحیح ایسی نہیں ہے جس کا انھوں نے حوالہ نہ دیا ہو۔

مولانا علیہ الرحمۃ کی عرق ریزی کا اندازہ اس سے لگانا چاہئے کہ انھوں نے تقریباً چار ہزار ایک سو (۴۱۰۰) اغلاط کی تصحیح کی ہے، جن میں پہلی جلد میں تقریباً ایک ہزار آٹھ سوتیس (۱۸۳۰) ہیں اور دوسری جلد میں دو ہزار دوسوستر (۲۲۷۰)۔ اس طرح انھوں نے حاشیے کا ایک ایک لفظ پڑھ کر اور ان کو اچھی طرح پرکھ کر اور اس کے بعد صواب وخطا میں تفریق کر کے یہ دو جلدیں تیار کی ہیں، یہ ایسا کام ہے اور ایسی عجیب وغریب کتاب ہے، جس سے میں نہیں سمجھتا کہ برصغیر کے اندر صحیح بخاری کا کوئی پڑھنے اور پڑھانے والا بے نیاز ہوسکتا ہے۔

مدینہ منورہ کی مشہور مسجدیں

تحریر: جمال الدین محمد بن احمد المطری ترجمہ: مولانا انور رشید الاعظمی استاذ مرقاۃ العلوم، مئو

(چھٹی قسط)

مسجد قباء:

محلّہ بنی عمرو بن عوف میں واقع ہے، مسجد سے پہلے کلثوم بن ہدم کے مویشیوں کا باڑہ تھا، انھوں نے رسولِ اکرم ﷺ کو دے دیا، آپ ﷺ نے اس کو مسجد بنایا، آپ ﷺ نے ہی اس کی بنیاد رکھی اور مدینہ منورہ تشریف لانے سے پہلے اسی میں نماز پڑھی۔

حضرت عویم بن ساعدہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اہل قباء سے فرمایا کہ اللہ رب العزت نے اپنی کتاب میں تمھاری بڑے اچھے انداز میں تعریف کی ہے، فرمایا ہے کہ ’’فيه رجال يحبون أن يتطهروا ‘‘ اس میں ایسے لوگ ہیں کہ خوب پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں، تم لوگ کس چیز کے ذریعہ پاکی حاصل کرتے ہو؟ انھوں نے جواب میں کہا کہ ہم اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتے کہ ہمارے پڑوس میں یہودی رہتے ہیں جو قضاءِ حاجت سے فراغ ہو کر اپنے مقام کو دھوتے ہیں، تو ہم بھی انھیں کی طرح دھوتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ اکرم ﷺ مسجد قباء کی زیارت کبھی سوار ہو کر کرتے اور کبھی پیدل۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ہی روایت کرتے ہیں کہ رسولِ اکرم ﷺ کبھی سواری کی حالت میں مسجد قباء تشریف لاتے تھے اور کبھی پا پیادہ، اس میں دو رکعت نماز پڑھتے تھے (مسلم)

عبداللہ بن دینار کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ہر شنبہ کو مسجد قباء تشریف لے جاتے تھے اور کہتے تھے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ ہر شنبہ کے دن مسجد قباء تشریف لاتے تھے۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضور ﷺ ہر ہفتہ کے دن مسجد قباء تشریف لے جاتے تھے،

کبھی پا پیادہ جاتے تھے کبھی سوار ہو کر۔

ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد قباء سوار ہو کر یا پا پیادہ تشریف لے جاتے تھے۔ عبید اللہ نافع کے بارے میں روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ نافع وہاں دو رکعت نماز ادا کرتے تھے۔

ابن نجار رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ابوعزیہ سے منقول ہے وہ کہتے ہیں کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ دوشنبہ اور پنجشنبہ کے دن مسجد قباء تشریف لاتے تھے، ایک روز (اسی عادت کے موافق) تشریف لائے تو دیکھا کہ وہاں اہل قباء میں سے کوئی نہیں تو فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دیکھا ہے، ہم اس (مسجد قباء) کے پتھر اپنے شکم پر لے کر منتقل کرتے تھے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی بنیاد رکھ رہے تھے اور جبریل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر آپ کی امامت فرماتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اللہ کی قسم کھا کر کہتے تھے کہ اگر ہماری یہ مسجد دنیا کے کسی بھی گوشے میں ہوتی تو بھی ہم اس کی طرف سفر کر کے آتے۔

امام بخاری نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں یہ روایت کیا ہے ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کے غلام سالم رضی اللہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے سابقین اولین مہاجرین رضی اللہ عنہم اجمعین کی مسجد قباء میں امامت کرتے تھے، جب کہ اقتداء کرنے والوں میں ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی ہوتے تھے۔

حضرت ابوامامہ بن سہل بن حُنیف اپنے والد سے روایت کرتے ہیں ان کے والد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے خوب اچھے طریقے سے کامل اور مکمل وضو کیا اور مسجد قباء آ کر اس میں دو رکعت نماز ادا کی تو اس کو ایک عمرہ کا ثواب ملے گا۔

عائشہ بنت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہا اپنے والد سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کرتی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ بخدا اگر میں مسجد قباء میں آ کر دو رکعت نماز ادا کروں یہ میرے لیے اس بات سے زیادہ پسندیدہ ہے کہ میں دو مرتبہ بیت المقدس آؤں، اور اگر لوگوں کو اس (مسجد قباء) کی فضیلت معلوم ہو جاتی تو لوگ سفر کر کے اس میں آتے۔

نافع حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے واسطے سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد قباء کے تیسرے ستون کے پاس نماز پڑھی ہے جو مسجد کے صحن میں واقع ہے۔

میں کہتا ہوں کہ مسجد قباء کی فضیلت کے بارے میں اب تک جو باتیں ذکر کی گئیں، مسجد قباء کی فضیلت اس سے کہیں زیادہ ہے، یہ مسجد اسی ہیئت پر باقی رہی جس ہیئت پر رسول اکرم ﷺ نے تعمیر فرمائی تھی، پھر عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت اس مسجد کی بھی تعمیر فرمائی تھی اسی ہیئت پر اب تک یہ مسجد ہے، مگر مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ پراگندہ ہوتی رہی اور منہدم ہوگئی، بعدازاں وزیر جمال الدین محمد بن علی بن ابی منصور اصفہانی نے اس کی تجدید کی اور باب عثمان کے سامنے جو باب جبریل کے نام سے مشہور ہے اس کی ازسرنو تعمیر کی، وزیر جمال الدین بنی زنگی کا وزیر تھا جو اپنی مشہور رباط کے اندر مدفون ہے، یہ تعمیر ۵۵۵ھ میں مکمل ہوئی۔

مسجد قباء کا فاصلہ مدینہ منورہ سے تین میل ہے، باجی (عبداللہ بن محمد علی باجی فقیہ ومحدث اندلس کے شہر باجہ کی طرف منسوب ہیں) کہتے ہیں کہ وہ ۲ میل کے فاصلہ پر ہے قاضی عیاض کہتے ہیں کہ دوتہائی فرسخ کی مسافت پر واقع ہے، مگر پہلا قول (۳ میل) صحیح ہے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے یہی منقول ہے۔

البتہ مسجد ضرار[1] کی نہ تو کوئی علامت ہے نہ ہی اس کی جگہ معلوم ہے، خواہ مسجد قباء کے ارد گرد ہو یا اس سے دوری پر، شیخ محبّ الدین بن النجار کا یہ کہنا کہ وہ مسجد قباء سے قریب ہے اور بڑی مسجد ہے اور دیواریں بھی اونچی ہیں، اور اس کی عمارت خوبصورت تھی، یہ ان کا وہم وخیال ہے جس کی کوئی اصل وبنیاد نہیں، مسجد قباء اور مدینہ منورہ کے درمیان ۳ میل کی مسافت ہے، قاضی عیاض کی یہی رائے ہے، محی الدین نووی رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی کے قائل ہیں۔

مسجد جمعہ:

محمد بن اسحاق مطلبی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قباء میں محلّہ بنی عمرو بن عوف میں دو شنبہ سہ شنبہ چہارشنبہ اور پنجشنبہ کے دن قیام فرمایا اور اپنی مسجد کی بنیاد رکھی پھر اللہ نے آپ ﷺ کو ان کے درمیان سے جمعہ کے روز نکالا، اور بنو عمرو کا خیال ہے کہ آپ ﷺ ان کے درمیان اس سے زیادہ قیام پذیر رہے، واللہ أعلم۔

میں کہتا ہوں کہ صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے ان کے درمیان ۱۴ رات قیام فرمایا، ابن

(۱) مسجد قباء کے شمال میں واقع تھی، نفاق اور مسلمانوں کے درمیان تفرقہ پیدا کرنے کی غرض سے تعمیر کی گئی تھی قرآن کریم میں ہے (والذین اتخذوا مسجداً ضراراً وکفراً) رسول اکرم ﷺ نے اس کو منہدم کرنے اور جلانے کا حکم فرمایا تھا۔

اسحاق کہتے ہیں کہ آپ ﷺ بنی سالم میں تشریف فرما تھے کہ جمعہ کا دن آ گیا تو آپ ﷺ نے وادیٔ رانوناء کے نشیبی حصہ میں جمعہ کی نماز ادا فرمائی، مدینہ منورہ میں آپ ﷺ کا یہ پہلا جمعہ تھا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ مسجد اس شخص کے دائیں ہاتھ واقع ہے جو مسجد قباء کی سمت میں جا رہا ہو، اس کے شمالی حصے میں ویران قلعے ہیں جنھیں مزدلف کہتے ہیں یہ عتبان [1] بن مالک کے قلعے ہیں، یہ مسجد انتہائی چھوٹی ہے اس کی دیواریں انسانوں کے نصف قد کے برابر ہیں اور پتھروں سے بنی ہیں، جب سیلاب آتا تھا تو اس مسجد اور عتبان بن مالک کے درمیان پھیل جاتا تھا، کیونکہ بن سالم بن عوف کے مکانات اس وادی کے مغرب میں پتھریلی زمین کے سرے پر واقع تھے، ان مکانات کے نشانات ابھی تک باقی ہیں، عتبان رضی اللہ عنہ نے نبیٔ کریم ﷺ سے درخواست کی تھی کہ ان کے مکان میں کہیں بھی نماز ادا فرمالیں تاکہ وہ اس جگہ کو اپنے لیے مسجد بنالیں (جہاں نوافل وغیرہ ادا کریں) چنانچہ نبیٔ اکرم ﷺ نے ان کی درخواست منظور فرما کر نماز ادا کی۔

مسجد فضیخ:

اس وقت مسجد الشمس کے نام سے مشہور ومعروف ہے، مسجد قباء کے مشرق میں وادی کے کنارے زمین کے بالائی حصہ میں واقع ہے، بڑے بڑے سیاہ پتھروں سے بنی ہے، یہ مسجد بہت چھوٹی ہے، محمد بن حسن عبداللہ بن حارث بن فُضیل سے وہ اپنے والد سے، وہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے جس وقت بنی نضیر کا محاصرہ فرمایا تو مسجد فضیخ کے مقام پر گنبد بنایا اور وہاں چھ دن قیام فرمایا، نیز کہتے ہیں کہ شراب کی حرمت کا حکم آیا تو ابوایوب رضی اللہ عنہ چند صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان اس جگہ میں تھے، ان کے ساتھ انگوری شراب کی پکھال تھی، حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ نے برتن میں سوراخ کرنے کا حکم دیا، حکم کی تعمیل میں برتن کے اندر سوراخ کر کے منھ کھول دیا گیا نتیجتاً انگوری شراب وہاں بہہ پڑی اسی مناسبت سے اس کا نام مسجد فضیخ ہو گیا۔

مسجد بنی قریظہ:

مسجد شمس سے دوری پر مشرقی حصہ میں حرہ شرقیہ سے قریب باب حدیقہ کے پاس واقع ہے جو اس وقت حاجزہ سے مشہور ہے، یہ حدیقہ فقراء کے لیے وقف تھا، چند ویران مکانات کے درمیان،

---

(۱) عتبان بن مالک انصاری جلیل القدر صحابی ہیں، نبیٔ اکرم ﷺ نے ان کے اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے درمیان رشتۂ مواخاۃ قائم فرمایا تھا، جنگ بدر واحد وخندق میں شریک ہونے کی سعادت حاصل ہوئی، حضرت معاویہ کے عہد خلافت میں انتقال کیا

یہ بنی قریظہ کے بعض مکانات تھے، باب حدیقہ کے شمالی حصہ میں، اس کے آس پاس اونچے طبقہ کے لوگ قیام کرتے تھے، اس کی عمارت خوبصورت تھی، مسجد قباء کی عمارت کے مانند، لمبائی ۴۵ ہاتھ تھی، چوڑائی بھی اسی کے بقدر، اس میں ستون، محرابیں، اور مینار تھے، مسجد قباء کے مینار سے ملتے جلتے تھے، شیخ محبّ الدین بن نجار کہتے ہیں کہ اس میں تقریباً ۱۶ استون تھے جو مرورایام کے سبب منہدم ہو گئے اور اس کا مینار بھی گر گیا، اس کے نشانات ابھی تک باقی ہیں جن سے اس کا پتہ چلتا ہے، وہاں کے سارے پتھر لوگ لے گئے۔

میں کہتا ہوں کہ اس کا نشان ساتویں صدی کی پہلی دہائی تک باقی تھا، پھر اس کی تجدید ہوئی اور اس پر نصف قد کے برابر دیوار قائم کردی گئی، تجدید کے بعد ہی سے اس کی جگہ کا علم ہوا ورنہ نشانات معدوم ہو چکے تھے، یہ جدید تعمیر والیٔ مدینہ ولید بن عبدالملک کے حکم کی تعمیل میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے مسجد قباء کی تعمیر کے موقع پر کی تھی۔

محمد بن عقبہ بن ابی مالک کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی قریظہ کی ایک عورت کے مکان میں نماز پڑھی جس کے بعد ولید بن عبدالملک نے مسجد کی تعمیر کے وقت اس مکان کو مسجد میں شامل کردیا، شیخ محبّ الدین بن نجار کہتے ہیں کہ علی بن رفاعہ اپنی قوم کے مشائخ وغیرہ سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی قریظہ کی ایک خاتون کے مکان میں نماز پڑھی پھر اس کے بعد اس مکان کو مسجد بنی قریظہ میں شامل کرلیا۔

مشربہ ام ابراہیم:

شیخ محبّ الدین کہتے ہیں کہ ابراہیم بن محمد بن یحییٰ بن محمد بن ثابت کا بیان ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشربہ ام ابراہیم علیہ السلام میں نماز پڑھی۔

میں کہتا ہوں کہ یہ جگہ مسجد بنی قریظہ کے شمال میں حرۃ شرقیہ کے قریب اس مقام پہ ہے جو دُشت سے معروف ہے، ان کھجوروں کے درختوں کے درمیان میں جو اشراف قواسم سے معروف ہیں، یہ اشراف قواسم قاسم بن ادریس بن جعفر برادر حسن عسکری کی اولاد سے ہیں، ان کو قواسم کہنے کہ وجہ یہ ہے کہ آل شعیب بن جمّاز انھیں سے ہیں۔

دار بنی الحارث بن الخزرج سے قریب جہاں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی زوجہ محترمہ حبیبہ بنت

خارجہ، یا بقول بعض مُلیکہ ہمشیرہ زید بن خارجہ (جنھوں نے بعد از مرگ گفتگو کی تھی) کے ساتھ قیام کیا تھا، وہ مقام ہے جو صُعیب کے نام سے معروف ہے وادی بطحان (۱) کے نشیب میں واقع ہے، وادی مذکور کے نشیب میں شمال مشرق میں رکن ماجشونیہ (۲) کے اندر، اس کی مٹی حاصل کی جاتی تھی جس کو پانی میں ڈال کر بخار کے دفعیہ کے لیے لوگ اس سے غسل کرتے تھے۔

محمد بن فضالہ ابراہیم بن جہم سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ حارث بن خزرج کے پاس تشریف لائے تو دیکھا کہ وہ لوگ سست ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ بنی حارث کیا ہوا تم لوگ سست کیوں ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہاں اے اللہ کے رسول ﷺ ہم کو بخار نے سست کر دیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا تم کہاں ہو؟ صُعیب (۳) سے کیوں بے نیاز ہو؟ لوگوں نے عرض کیا کہ ہم اس کا کیا کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی مٹی لے کر پانی میں ڈال دو، پھر کوئی اس پانی میں تھک تھکا دے اور یہ پڑھے **بسم اللّٰہ تراب أرضنا بریق بعضنا، شفاء لمریضنا باذن ربنا.**

شیخ محبّ الدین کہتے ہیں کہ ابوالقاسم طاہر بن یحییٰ بن حسن بن جعفر بن عبداللہ بن حسین بن علی بن حسین بن علی بن ابوطالب کا بیان ہے کہ صُعیب وادی بطحان ماجشونیہ سے قریب ہے جس میں ایک گڈھا ہے جس سے لوگ (مٹی) لیتے ہیں، اگر کسی کو بخار وغیرہ کی وجہ سے سستی لاحق ہوتی ہے تو

---

(۱) وادی بطحان: ایک بڑی وادی ہے جو مدینہ کو جنوب سے شمال تک دو حصوں میں منقسم کرتی ہے کیونکہ وہ قباء کے جنوب میں پتھریلی زمین سے نشیب کی طرف جاتی ہے اور مسجد قباء کے مشرقی حصہ میں اپنی سیلان گاہ سے گذر کر مسجد غمامہ تک پہنچتی ہے، جو مسجد نبوی کے مغرب میں ہے، اس کے مغربی حصہ سے گذر کر مسیح کا رخ کرتی ہے یہاں تک کہ شمال مدینہ میں مجمع السیول سے مل جاتی ہے، مگر یہ کہ یہ وادی اس وقت عمارتوں اور راستوں کی وجہ سے معدوم ہوگئی ہے، اور صرف ایک باندھ کی شکل میں باقی ہے، سمہودی ۳/۱۰۷۱، ۱۰۷۲

(۲) ایک باغ کا نام ہے جو عہد قریب تک مدجشونیہ کے نام سے معروف تھا۔

(۳) صُعیب: صعب کی تصغیر ہے کوئی جگہ یا کوئی گڈھا ہے جو وادی بطحان کے کنارے اس باغ کے پاس ہے جسے ماجشونیہ کے نام سے جانا جاتا تھا، زمانہ گذشتہ میں لوگ اس کی مٹی حاصل کرتے تھے، بخار سے شفاء یابی کی نیت سے، موجودہ دور تک یہ سلسلہ چلتا رہا، یہ ایسی بدعت ہے جو رسول اکرم ﷺ یا کسی صحابی سے ثابت نہیں، اور جس حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا وہ حدیث مرسل ہے، (سمہودی ۱/۶۸، الرفاعی) البتہ رسول اکرم ﷺ سے منقول دعا: **بسم اللّٰہ تراب أرضنا، بریق بعضنا، شفاء لمریضنا باذن ربنا** صحیح اس طرح ہے **بسم اللّٰہ تراب أرضنا، بریقة بعضنا، یشفی سقیمنا، باذن ربنا** بخاری نے نقل کیا ہے، انھیں کے الفاظ بھی ہیں، مسلم میں بھی اسی جیسے لفظ سے مروی ہے، سفیان بن عیینہ سے وہ عبدربہ بن سعید الانصاری سے وہ عمر سے وہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے وہ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتی ہیں، نیز جملہ (بأرضنا) سے ساری زمینیں مقصود ہیں، ایک قول سر زمین مدینہ کا بھی ہے، لیکن صُعیب کے ساتھ مخصوص کرنا غلط ہے۔

اس کو استعمال کرتا ہے، شیخ محبّ الدین رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ گڈھا دیکھا ہے کہ آج بھی لوگ اس سے لے کر استعمال کرتے ہیں، اور لوگوں کا بیان ہے کہ انھوں نے اس کا تجربہ کیا تو اس کے مطابق صحیح پایا، پھر شیخ محبّ الدین رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے بھی اس کا استعمال کیا ہے۔

مسجد بنی ظَفَر:

حرۃ شرقیہ کے کنارے بقیع کے مشرق میں واقع ہے، مسجد بغلہ (۱) سے مشہور ہے، محمد بن انس ابن فضالہ الظفری اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پتھر پر بیٹھے ہیں جو مسجد بنی ظَفَر میں ہے، مزید کہتے ہیں کہ زیاد بن (۲) عبید اللہ نے حکم دیا کہ وہ پتھر وہاں سے ہٹا دیا جائے تو بنی ظفر کے مشائخ آئے اور اس کو اس بات کی اطلاع دی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس پر بیٹھے تھے (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن سے لمس کی وجہ سے اس کی عظمت وشان میں اضافہ ہوگیا) اس لیے اس نے اس کو اس کی جگہ واپس کردیا، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی عورت اپنے لڑکے کو لے کر اس پتھر پر بیٹھتی ہے تو حاملہ ہو جاتی ہے، اور وہاں پتھریلی زمین کے بعض نشانات ہیں، لوگوں کا کہنا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بغلہ کے کھر کے نشانات ہیں، اور اس کے مغربی سمت میں پتھر پر ایک ایسا نشان ہے جو کہنی کے مانند ہے، ایک دوسرے پتھر پر انگلیوں کے نشانات ہیں جس سے لوگ تبرک حاصل کرتے ہیں، (واللہ أعلم)

مسجد بنی معاویہ بن مالک بن نجار خزرجی:

عتیک بن حارث کہتے ہیں کہ ہمارے پاس عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بنی معاویہ میں تشریف لائے (بنی معاویہ ایک انصاری بستی ہے) انھوں نے کہا کہ تمھیں معلوم ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمھاری اس مسجد میں کس مقام پر نماز ادا فرمائی ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ہاں مجھے معلوم ہے، اور میں نے مسجد کے اس حصہ کی طرف اشارہ کرکے بتایا، پھر انھوں نے پوچھا کہ تمھیں معلوم ہے کہ وہ کون سی تین دعائیں ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مانگی ہیں؟ میں نے اثبات میں جواب دیا، انھوں نے کہا کہ مجھے ان کے

---

(۱) مسجد بغلہ چودہویں صدی کے نصف ثانی تک اس کا وجود تھا لیکن ان بدعات وخرافات کے سبب جن کا وہاں ارتکاب ہورہا تھا، اور اس کے پتھروں کو ہاتھ لگا کر برکت حاصل کی جاتی تھی اور لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خچر کے کھر کا وہ نشان ہے انھیں اسباب کے پیش نظر اسے زمین بوس کرکے اس کے مقام پر ادارہ ہیئۃ الامر بالمعروف والنہی عن المنکر قائم کردیا گیا ہے۔

(۲) زیاد بن عبید اللہ حارثی: ابوجعفر منصور کے ماموں اور اس کی طرف سے مقرر کردہ مدینہ کے والیوں میں سے ایک والی تھا ۱۴۱ھ تک مدینہ کے امیر رہے۔

بارے میں بتاؤ، میں نے کہا کہ آپ ﷺ نے یہ دعا مانگی کہ ان (مسلمانوں) پر غیر مسلموں میں سے کسی دشمن کو غالب نہ کرے، یہ دعا مقبول ہوئی، دوسری دعا یہ تھی کہ ان کو خشک سالی کے ذریعہ ہلاک نہ کرے، یہ دعا بھی مقبول ہوئی، تیسری دعا یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے مابین اختلاف نہ پیدا کرے، یہ دعا مقبول بارگاہ نہیں ہوئی، عبداللہ بن عمر نے کہا کہ تم نے سچ کہا فتنہ وفساد تو قیامت تک جاری رہے گا، موطأ، ۱/۲۱۶)

میں کہتا ہوں کہ اس وقت یہ مسجد مسجد اجابہ کے نام سے معروف ہے، بقیع کے شمال میں ہے عُریض کی طرف جانے والے کے بائیں ہاتھ چند ٹیلوں کے درمیان ہے، یہ ٹیلے بنی معاویہ بستی کے آثار ہیں، اس وقت یہ مسجد (۱) ویران ہے۔

مسجدِ فتح:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مسجد فتح کے اندر دوشنبہ، سہ شنبہ اور چہارشنبہ کے روز دعا فرمائی، دعا کی قبولیت کا ظہور چہارشنبہ کے روز دو نمازوں کے درمیان میں ہوا، اس وقت آپ کا چہرۂ انور خوشی سے کھل اٹھا۔

انھیں جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کا گذر مسجد فتح کے پاس سے ہوا جو پہاڑ پر واقع ہے، اسی اثناء میں نماز عصر کا وقت آ گیا، چنانچہ آپ پہاڑ پر چڑھے اور مسجد میں نماز عصر ادا کی۔

ہارون بن کثیر اپنے والد سے وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے معرکۂ خندق کے روز پہاڑ پر واقع مسجد فتح کے درمیانی ستون کے مقام پر احزاب کے لیے بد دعا فرمائی۔

میں کہتا ہوں کہ یہ مسجد مغربی سمت سے جبل سلع کے ایک ٹکڑے پر واقع ہے، اور اس کے مغرب میں وادی بطحان ہے، جس میں متعدد چشمے ہیں، بعض کا پانی جاری ہے، اور بعض میں پانی نہیں ہے، یہ جگہ سیح کے نام سے معروف ہے، (سیح مدینہ کا ایک مشہور محلّہ ہے) اس مسجد تک شمالی اور مشرقی دو سیڑھیوں کے ذریعہ چڑھ کر پہنچا جاتا ہے، موجودہ تعمیر سے پہلے عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی تعمیر کے

---

(۱) مسجد اجابہ: قبیلۂ اوس کی بستی بنی معاویہ میں واقع تھی، مشہور مساجد میں سے ایک ہے، مسجد نبوی سے چار سو میٹر کے فاصلہ مشرقی شمال میں واقع ہے، ساتویں اور آٹھویں صدی میں ویران ہوگئی تھی پھر سمہودی کے زمانہ میں مرمت کی گئی پھر اُجڑی، پھر دوبارہ تعمیر کی گئی پھر ۱۴۱۹ھ میں انتہائی کشادہ کردی گیی اور عمارت بھی سعودی حکومت کے عہد میں نہایت عالیشان ہوگئی۔

زمانہ کے اس میں تین ستون تھے، اسی بنا پر حدیث سابق کے اندر درمیانی ستون کا تذکرہ آیا ہے، مرور ایام کے سبب وہ منہدم ہوگیا، پھر مملو کی حکومت کے عہد کے ایک وزیر امیر سیف الدین حسین ابن ابی الہیجاء نے ۵۷۵ھ میں اس کی جدید تعمیر کی، اسی طرح ان دو مسجدوں کی بھی از سر نو تعمیر کی جو جانب قبلہ اس مسجد مذکور سے نیچے واقع ہیں پہلی مسجد جو قبلہ والی سمت سے متصل ہے مسجد امیر المؤمنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے نام سے معروف ہے، دوسری مسجد شمالی سمت سے متصل ہے وہ مسجد سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے نام سے معروف ومشہور ہے، اس کی تجدید ۵۷۵ھ میں ہوئی۔

شیخ محبّ الدین نجار کہتے ہیں کہ ان دو مسجدوں کے ساتھ ایک تیسری مسجد بھی تھی جس کا قبلہ والا حصہ اجڑا ہوا ہے، اس کے پتھر لوگ اٹھا لے گئے اور وہ منہدم ہوگئی اسی لیے اس کا نام ونشان بھی باقی نہیں۔ شیخ محبّ الدین مزید کہتے ہیں کہ مُعاذ بن سعد رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد فتح میں نماز پڑھی ہے نیز اس کے آس پاس کی مسجدوں میں اور مسجد قبلتین میں بھی نماز ادا فرمائی ہے۔

مسجد قبلتین:

شیخ محبّ الدین رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ عثمان بن محمد بن اخنس کا بیان ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی سلمہ میں اُمّ بشر نامی مَسلَمی عورت کی زیارت کی، اس عورت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے کھانا تیار کیا اتنے میں ظہر کی نماز کا وقت ہوگیا تو نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے مسجد قبلتین میں ظہر کی نماز ادا فرمائی، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم دو رکعت نماز ادا کر چکے تو اللہ رب العزت کی جانب سے حکم ہوا کہ آپ خانۂ کعبہ کی جانب رخ فرما لیں، چنانچہ تعمیل حکم الٰہی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم (حالت نماز ہی میں) کعبہ مشرفہ کی جانب متوجہ ہوگئے، اسی بنا پر اس مسجد کا نام مسجد قبلتین ہوگیا، اس دن ظہر کی نماز ۴ رکعت ادا کی گئی تو اس طرح کہ ۲ رکعت تو بیت المقدس کی جانب رخ کر کے، اور ۲ رکعت خانۂ کعبہ کی طرف متوجہ ہوکر، سعید بن مسیّب کہتے ہیں کہ تحویل قبلہ معرکۂ بدر سے دو ماہ قبل پیش آیا، اور ہمارے نزدیک تحقیقی بات یہ ہے کہ تحویل قبلہ مسجد قبلتین میں ظہر کی نماز میں پیش آیا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ مسجد مسجد فتح سے مغربی سمت میں کچھ فاصلہ پر وادی عقیق کے کنارے ایک ٹیلہ پر واقع ہے، اور اس کے آس پاس کا علاقہ ویران ہے سیاہ پتھریلی زمین ہے، یہ جگہ پست وہموار علاقہ سے پہچانی جاتی ہے، اس کے اردگرد کنویں اور کھیت ہیں، جو عَوص کے نام سے مشہور ہیں، مشہور

ومعروف جُرف [1] کے کھیتوں کے سامنے ہے، مذکورہ مسجد بنی سلمہ نامی بستی میں واقع ہے، جسے خرباء [2] بھی کہا جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس مسجد میں یعنی بنی سلمہ کی بستی کی مسجد بنی حرام میں رسول اکرم ﷺ نے بلغم دیکھا تو اس کو کھجور کے گچھے کی جڑ سے جو آپ ﷺ کے مبارک ہاتھوں میں تھی رگڑ دیا، پھر آپ ﷺ نے خوشبو منگوائی اور اس کو اس مذکورہ گچھے کی جڑ کے سرے پر لگا دیا، پھر اس کے بعد اس کو بلغم کی جگہ رکھ دیا، چنانچہ یہ پہلی مسجد تھی جس میں خوشبو استعمال کی گئی۔

(جاری ہے)

☆☆☆☆☆☆☆☆

صفحہ ۶۳ کا بقیہ

شفاخانوں سے ملحق یہ کتب خانے متعدد اسلامی شہروں میں طبیبوں اور اس فن کے ماہروں کے لیے اس کی مختلف شاخوں میں تصنیف وتالیف میں معاون ومساعد بنے۔

تاریخوں میں تقریباً سو (۱۰۰) ایسی کتابوں کا نام محفوظ ہے جو طب کی مختلف شاخوں میں تصنیف کی گئی تھیں، ان میں بعض کتابیں تو عام امراض سے متعلق تھیں، اور بعض کسی خاص پہلو پر تصنیف کی گئی تھیں، اور کچھ کتابیں ایسی بھی تھیں جو غذاؤں اور ان کی ترتیب پر لکھی گئی تھیں، بعض حفظان صحت سے تعلق رکھتی تھیں، اور بہت سے طبیبوں نے اپنے تجربات حوالۂ قرطاس کر دیے جو بعد میں آنے والوں کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔

اُس دور میں ان بڑے بڑے کتب خانوں پر مشتمل ان عظیم الشان شفاخانوں کے وجود سے انسان حیرت واستعجاب میں پڑ جاتا ہے، جو دور حاضر کے بڑے بڑے ہاسپٹلوں کا مقابلہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور جو اسلام کے قابل فخر کارناموں میں شمار کی جا سکتی ہے۔

(جاری ہے)

(۱) مشہور محلّہ ہے مدینہ کے قدیم نشانات منزل میں سے ہے اب بھی اسی نام سے مشہور ہے، بئر رومہ کے مغرب میں طریق تبوک کے مشرق میں واقع ہے، شمالی حصہ میں طریق جامعات تک پھیل گیا ہے۔

(۲) مدینہ منورہ میں بنی سلمہ نامی بستی میں ایک مکان ہے جو مسجد فتح کے مغرب میں ان کے اس قلعہ کے پاس واقع ہے جو مذاذ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

حضرت علی زین العابدین رضی اللہ عنہ کا اسوہ اور کردار امت مسلمہ کے لیے لائق تقلید

از: ڈاکٹر عبدالمعید صاحب، کھیری باغ روڈ، مئو

آپ کا لقب زین العابدین ہے، بہت خدا ترس اور بڑے عبادت گزار تھے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے اور حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کے پوتے تھے، دلوں میں ان کی ایسی عظمت و وقعت اور نگاہوں میں ایسا احترام تھا کہ ہشام بن عبدالملک اپنی ولی عہدی کے زمانہ میں ایک بار حج کو آیا تھا، اسی سال علی بن الحسین رضی اللہ عنہ بھی حج کو آئے تھے، اتفاق سے طواف میں ساتھ ہوگیا، اور ہشام ان سے پہلے حجر اسود کے پاس پہنچا، اس نے انتہائی کوشش کی کہ حجر اسود کا بوسہ نصیب ہو جائے مگر کسی طرح ممکن نہ ہوا، اس کے بعد علی بن الحسین رضی اللہ عنہ وہاں پہنچے تو سارے لوگ اپنی اپنی جگہ ٹھٹک گئے اور جو حجر کے پاس تھے وہ وہاں سے ہٹ گئے اور انھوں نے باطمینان حجر اسود کو چوما۔

ہشام کے آدمیوں نے کسی سے پوچھا یہ کون آدمی ہے؟ اس نے کہا میں نہیں پہچانتا، اس موقع پر فرزدق شاعر موجود تھا، اس نے نہایت جرأت سے کہا میں ان کو پہچانتا ہوں، یہ علی بن الحسین رضی اللہ عنہ ہیں اور اپنا وہ مشہور قصیدہ پڑھا جس کے ابتدائی شعر یہ ہیں:

هذا ابن خير عباد اللّٰه كلهم — هذا التقى النقى الطاهر العلم

هذا الذى تعرف البطحاء وطائة — والبيت يعرفه والحل والحرم

(اعیان الحجاج جلد ۱ ص ۱۰۳-۱۰۲، از محدث کبیر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رضی اللہ عنہ)

تواضع:

آپ جب مسجد میں تشریف لاتے تو زید بن اسلم کے حلقہ میں بیٹھ جاتے، نافع بن جبیر نے ان سے کہا کہ آپ سید الناس ہیں، آپ اہل علم اور قریش کے حلقہ کو چھوڑ کر اس سیاہ غلام کے پاس بیٹھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: **إنما يجلس الرجل حيث ينتفع وأن العلم يطلب حيث كان**

(آدمی وہیں بیٹھتا ہے جہاں اس کا نفع ہو اور علم جہاں بھی ہو اسے طلب کرنا چاہیے)۔

(البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۱۰۶)

حلم:

ایک بار ان کی باندی وضو کرا رہی تھی، لوٹا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ کے چہرہ پر گر پڑا اور ان کا چہرہ زخمی ہو گیا، جب آپ نے سر اٹھا کر اس کو دیکھا تو اس نے کہا: اللہ کا ارشاد ہے: **والکاظمین الغیظ** (اور وہ لوگ غصہ کو پینے والے ہیں) آپ نے فرمایا میں غصہ کو پی گیا، پھر اس نے کہا: **والعافین عن الناس** (اور وہ لوگ، لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں) آپ نے فرمایا میں نے تم کو معاف کر دیا، پھر اس نے کہا: **واللّٰہ یحب المحسنین** (اور اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کو محبوب رکھتے ہیں)۔ آپ نے فرمایا میں نے اللہ کے لیے تم کو آزاد کر دیا۔

جود وسخا:

آپ رات میں کثرت سے صدقہ کرتے تھے، آپ فرماتے تھے کہ رات میں صدقہ کرنا اللہ کے غصہ کو بجھاتا ہے، قلب اور قبر کو منور کرتا ہے اور آدمی سے قیامت کے اندھیروں کو دور کر دیتا ہے۔

(البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۱۰۵)

آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ جو کربلا میں ڈھائی تین سال کے تھے (طبری جلد ۱۳ ص ۹۰) فرماتے ہیں کہ میرے والد نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنا سارا مال لٹا دیا اور فقراء پر تقسیم کر دیا، آپ کی سخاوت کے سلسلہ میں یہ واقعہ مشہور ہے کہ مدینہ شریف کے اکثر گھروں میں کوئی شخص رات کے وقت جاتا اور پوشیدہ طور پر روپیہ پیسہ یا خوراک یا پوشاک دے آتا تھا۔ کسی کو معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ یہ کون شخص ہے۔ جس دن حضرت علی زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا، اس دن سے فقراء کی یہ غیبی مدد بند ہو گئی، تب لوگوں کو گمان ہوا کہ وہ چھپ کر صدقہ دینے والا اہل بیت حسینی کا یہی نامور فرزند تھا، **رحمہ اللّٰہ رحمةً واسعةً.**

(سیرت حضرت علی زین العابدین رحمہ اللہ ص ۲۵-۲۴، از مولانا سراج الحق صدیقی مچھلی شہری)

سفیان سے مروی ہے کہ ایک بار انھوں نے حج یا عمرہ کا ارادہ کیا، اس کی اطلاع ان کی بہن سکینہ کو ہوئی تو سکینہ نے ایک ہزار درہم خرچ کر کے ان کے لیے دسترخوان تیار کیا، اور تیاری کے بعد

ان کی خدمت میں بھجوایا، انھوں نے قبول کرلیا، لیکن حرہ پہنچ کر سب کا سب مسکینوں میں بانٹ دیا۔
(اعیان الحجاج جلد ۱ ص ۱۰۳)

نکاح میں اتباع سنت:

حضرت زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بیٹی کا نکاح اپنے غلام کو آزاد کر کے کر دیا، اور اپنا نکاح اپنی باندی کو آزاد کر کے کرلیا، اس پر عبدالملک بن مروان نے آپ کو عار دلایا تو حضرت علی زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ نے عبدالملک بن مروان کو لکھا: تمھارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہترین نمونہ ہیں، آپ نے صفیہ بنت حُیی کو آزاد کیا اور ان سے نکاح کرلیا اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو آزاد کر کے اپنی پھوپھی زاد بہن کو ان کے نکاح میں دے دیا۔ (الطبقات الکبریٰ جلد ۵ ص ۱۶۵)

ہندوستانی مسلمان سب کے سب حُر الاصل ہیں لیکن یہاں عہد جاہلیت کے نسبی تفاخر اور برادری واد کی وجہ سے ایک برادری دوسری برادری میں شادی نہیں کرتی، کاش کہ یہاں کے مسلمان سید السادات کے اس اسوہ سے سبق حاصل کرتے۔

کوفی سبائیوں کے متعلق آپ کا قول:

آپ کا ارشاد ہے: کوفیوں، سبائیوں کے کہنے میں تو اب کبھی بھی نہ آنا چاہئے چاہے خواہ وہ قرآن کا بھی جامہ پہن کر آئیں اور قسمیں کھائیں، والد ماجد سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اپنی سادہ دلی اور صاف دلی کے باعث ان کے بلانے پر اعتماد کر کے مکہ و مدینہ کے قیام امن و عافیت چھوڑ کر کوفہ چلے گئے، ان کے ساتھ بھی جب انھوں نے ایسا سفاکانہ سلوک کیا تو اب پھر ان سے کیا امید رکھی جا سکتی ہے۔
(سیرت حضرت علی زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ ص ۱۶)

آپ اور جنگ کربلا:

آپ کی زندگی کا ایک اہم اور قابل ذکر واقعہ حادثہ کربلا ہے، اُس وقت آپ ۲۳ برس کے جوان تھے اور بقول طبری گھوڑے پر سوار ہو کر چلتے تھے، (ایضاً ص ۶۱) اپنے والد محترم، دوش نبوی کے سوار اور جنتی جوانوں کے سردار سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ، بیکسانہ شہادت انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی، سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے سیدنا علی اصغر (عرف عابد بیمار، سجاد، زین العابدین) رحمہ اللہ کا سب سے زیادہ حیرت انگیز کردار یہ ہے کہ والد محترم رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد انھوں نے بخوشی

یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی اور اس پر مرتے دم تک قائم رہے، جس کا پس منظر یہ ہے۔

آپ اپنے جد امجد سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے سامنے ہی کوفہ میں پیدا ہوئے تھے اور شہادتِ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے حادثہ فاجعہ (۴۰ھ) کے وقت آپ کی عمر دو برس کے لگ بھگ تھی۔ (سیرت حضرت زین العابدین ص۶) آپ کی ولادت سے قبل ملت اسلامیہ میں ''الفئۃ الباغیۃ'' (سبائیوں کی باغی ٹولی) نے جنگ وجدال کا ماحول بنا رکھا تھا۔ اس فتنہ کے بانی مبانی یہود اور مجوس تھے اور عبداللہ بن سبا اس کا سرغنہ تھا، لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے اہل بیت کے فضائل ومناقب بیان کرتا تھا۔ عبداللہ ابن سبا پہلے یہودی تھا، ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مسلمان ہوا، اس نے اپنے جیسے چند ہم خیال لوگوں کو لے کر دین میں رخنہ اندازی اور فتنہ انگیزی شروع کی جس کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے انتظامات پر حرف گیری کرنے لگے اور ممالک اسلامیہ کے صوبہ داروں اور حکام پر نکتہ چینی کرنے لگے اور یہ فتنہ یہاں تک بڑھا کہ فتنہ پردازوں کی یہ جماعت اول اول تو حکام اور امراء بلاد اسلامیہ کے تبدیلی اور معزولی کی درخواست کیا کرتی تھی اور اب علانیہ طور پر امیر المؤمنین عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی معزولیت کی گفتگو کرنے لگے۔

(خلافت راشدہ، انتخاب ازالۃ الخفاء از مولانا محمد ادریس کاندھلوی ص۱۰۵)

چنانچہ اسی ''الفئۃ الباغیۃ'' (سبائیوں کی باغی ٹولی) نے ۳۵ھ میں آپ پر بے بنیاد الزام لگا کر شہید کیا کہ یہ کنبہ پروری کرتے ہیں، اور بیت المال کا روپیہ برباد کرتے ہیں وغیرہ۔

(سیرت حضرت زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ ص۱۳)

قصاص کی غرض سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مدینہ سے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ عراق سے روانہ ہوئے، دونوں فوجیں جب آمنے سامنے ہوئیں تو دونوں طرف سے قصاص کے مسئلہ پر اتفاق ہو گیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وقت مانگا اور یہ طے ہو گیا کہ کل فریقین کا لشکر بلا جنگ وجدال اور بلا قتل وقتال واپس لوٹ جائے، لیکن یہ امر فئۃ باغیہ اور گروہ سبائیہ کو نہایت شاق گذرا، یہ لوگ فساد ہی کی غرض سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں گھسے ہوئے تھے، مقصود ہی دین محمدی کی تخریب تھی، اس گروہ پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ باہمی مصالحت اس لیے ناگوار ہوئی کہ تخریب اور فساد کا موقع ہاتھ سے نکل گیا، اس لیے ان مفسدین نے مشورہ کر کے رات کے اخیر حصہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے لشکر پر حملہ کر دیا، اور تیر برسانے شروع

کر دیے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کی مطلق خبر نہ تھی، چنانچہ ہنگامۂ کارزار اس قدر گرم ہوا کہ طرفین کے تیرہ ہزار انسان مقتول ہوئے کافی کشت وخون ہو چکنے کے بعد اِدھر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اُدھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو اصل حقیقت کا علم ہوا، انکشاف حقیقت کے بعد پھر صلح صفائی ہوگئی، دونوں فریق ایک دوسرے سے مل کر زار وقطار روئے اور واپس ہو گئے۔

(خلافت راشدہ، ص ۱۶۸-۱۶۷)

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان ۳۷ھ میں جنگ صفین ہوئی، ایک ماہ کی اس لڑائی میں طرفین کے تقریباً ستر ہزار آدمی مارے گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لی تو سبائیوں کی باغی ٹولی آپ کو ''سوّد اللّٰہ وجھہ'' کی گالیاں دینے لگے، اور انہی میں سے بعض حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا کہنے لگے۔ (سیرت حضرت زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ ص ۱۴) صلح کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ کی طرف اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ شام کی طرف واپس ہو گئے، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج سے آٹھ ہزار سے زیادہ لوگ علیٰحدہ ہو گئے اور مقام حروراء میں جمع ہو گئے، یہی لوگ خارجی کہلائے، ان لوگوں کا خیال تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ منصفی قبول کرنے کی وجہ سے کافر ہو گئے ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جب ان کی خبر پہنچی تو لشکر لے کر ان کی طرف خروج کیا اور مقام نہروان (۳۹ھ) پہنچ کر ان پر حملہ کیا اور سب کو تہ تیغ کیا، صرف چند آدمی بچے، پھر یہ لوگ روپوش ہو گئے اور پوشیدہ طور پر سازشیں کرتے رہے، یہاں تک کہ ان میں سے عبدالرحمٰن بن ملجم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو صبح کی نماز کو جاتے ہوئے شہید کیا۔　(خلافت راشدہ ص ۱۷۴-۱۷۳)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت (۴۰ھ) کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو پہلے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہی نے ان کے پاس پیغام صلح بھیجا (بخاری شریف جلد اول ص ۳۷۳ باب الصلح) ان کو بھی باغی ٹولی نے پریشان کر رکھا تھا، انھیں دھکے دے کر پیروں تلے سے مصلیٰ اور کاندھے سے چادر تک کھینچ لی اور مقام ساباط میں ان پر قاتلانہ حملہ کیا لیکن محفوظ رہے، اس لیے وہ کوفیوں سے متنفر تھے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے سادہ کاغذ پر اپنے دستخط کر کے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیا کہ اس پر جو شرائطِ صلح چاہیں لکھ دیں، مجھے سب منظور ہے۔ صلح نامہ مرتب ہوا، طرفین کے دستخط ہوئے پھر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو کوفے کی جامع مسجد میں بلا کر سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے اس صلح کا اعلان عام کیا اور اس کی توثیق کے لیے سب کے سامنے

خودبھی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کرلی۔کوفہ کے باغی ٹولی کو یہ صلح اتنی ناپسند تھی کہ ایک بدتمیز نے آکر سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے منھ پر یہ کہا:**یا مسود وجوه المسلمین** (اے مسلمانوں کے منھ پر کالک لگانے والے) دوسرے نے آکر کہا:**یا مذل المسلمین** (اے مسلمانوں کی ذلت کرانے والے)۔

اس صلح سے خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد سے انتشار واختلاف کی کیفیت ختم ہوگئی اور مسلمانوں کوایسی راحت ملی کہ اس سال کا نام''عام الجماعۃ'' رکھ دیا گیا،لوگوں کی فکریں جوآپس کی خونریزی میں کام کررہی تھیں،ملت کی بہبود،دین کی اشاعت اور جہاد میں لگنی شروع ہوگئیں۔(سیرت حضرت زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ ص ۴۹،۴۸،۴۷مختصراً)

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیس سالہ عہد خلافت میں نہ صرف اسلام اور مسلمانوں کو بلکہ انسانیت کوبھرپور فائدہ پہنچایا اورخلیفۂ اسلام کی حیثیت سے نہایت شاندار کام انجام دیے،آخر ۲۶ر رجب ۶۰ھ کوامت کومنتظم ومجتمع،ملک کوترقی کی راہ پر گامزن اور فضا کوساکن چھوڑ کر جنت الفردوس کو سدھار گئے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے انتقال کے وقت حضرت علی زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کی عمر ۲۲ برس ہوچکی تھی،آگے کے تمام واقعات کے آپ عینی شاہد ہیں۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی پیشین گوئی:

بے موقع نہ ہوگا اگر یہاں طبری کا ایک جملہ بھی نقل کردیا جائے جواس نے سیدنا''معاویہ کی وصیت کے تحت ابومخنف کی روایت سے لکھا ہے ....طبری جلد ۶ ص ۱۸۰ میں وصیت کے ختم کے قریب الفاظ یہ ہیں:''**إمام الحسین رضی اللّٰه عنه بن علی رضی اللّٰه عنه فرجل خفیف .... لا اظن اهل العراق تارکیه .... وأرجو ان یکفیکه اللّٰه بمن قتل اباه وخذل اخاه** ''یعنی تمھارے مقابلہ میں حسین رضی اللہ عنہ بن علی رضی اللہ عنہ جو ہیں تو عراقی (کوفی) انھیں عافیت سے بیٹھا رہنے نہ دیں گے بلکہ ان کوتمھارے مقابلہ پر ابھار کرلے آئیں گے اور میں امید کرتا ہوں کہ تم کواُن سے لڑنے کی نوبت آنے نہ پائے گی،ان کوبھی وہی لوگ نپٹا دیں گے جنھوں نے ان کے والد علی رضی اللہ عنہ کوشہید کیا اوران کے بھائی حسن رضی اللہ عنہ کا ساتھ نہ دیا۔

(سیرت حضرت زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ ص ۱۸۲-۱۸۱)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات پر کوفہ کا سبائی گروہ بہت خوش ہوا اور انھوں نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی، (البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۱۵۱)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیس سالہ خلافت کے دوران ان سبائی منافقین کو کھیل کھیلنے کا موقع نہ مل سکا، لیکن جیسے ہی آپ کا وصال ہوا یہ گروہ آمادۂ فتنہ وفساد ہوگیا اور سازشیں کرنے لگا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پاس کوفہ سے وفود اور ان کے خطوط آنے لگے، انھوں نے ڈیڑھ سو خطوط لکھے اور جلد آنے کا تقاضہ کرنے لگے، ان خطوط ووفود کا منشا کیا تھا۔ حافظ ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں:

جعلوا يستحثونه ويستقدمونه عليهم ليبايعوه عوضاً عن يزيد (۸/۱۵۱) یعنی عراقی لوگ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ورغلانے، اور اپنے پاس آنے کی دعوت دینے لگے، تاکہ یزید کی جگہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کریں۔

(تبصرہ بر ''شہید کربلا و یزید'' ص ۱۳۹ از محدث کبیر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ)

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اس بات کی تحقیق کے لیے کہ کوفیوں کی باتوں اور ان کی تحریروں میں کتنی صداقت ہے، اپنے چچازاد بھائی مسلم کو کوفہ بھیجا، مسلم کوفہ پہنچے اور وہاں اٹھارہ ہزار آدمیوں نے ان کے ہاتھ پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو امیر بنانے کی بیعت کی، اس کے بعد مسلم نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ آپ تشریف لائیے **فقد تمهدت له البيعة والامور** (ابن کثیر جلد ۸ ص ۱۵۲) آپ کے لیے بیعت اور سارے کام ٹھیک ہوگئے۔ (ایضاً ص ۳۹)

اب حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کوفہ جانے کا مصمم ارادہ کرلیا، عوام اور خواص مسلمین کے ۱۵-۱۶ آدمیوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو عین ہمدردی اور محبت میں کوفہ جانے سے منع کیا، قسم دلائی، کوفہ والوں کے سیاہ کارنامے یاددلائے: **وأمروه بالمقام بمكة، وذكروه ماجرىٰ لأبيه وأخيه معهم۔**

(البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۱۵۹)

آپ کو مکہ میں قیام کرنے کو کہا اور ان لوگوں نے کوفیوں کی اس بدسلوکی کا بھی ذکر کیا جو ان کے والد (حضرت علی رضی اللہ عنہ) اور ان کے بھائی (حضرت حسن رضی اللہ عنہ) کے ساتھ کیا تھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: اے میرے چچا کے بیٹے! **إني أتصبر ولا أصبر إني أتخوف عليك هذا الوجه الهلاك، إن أهل العراق قوم غدر فلا تغترن بهم.**

(البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۱۶۰)

بیشک میں صبر کرنا چاہتا ہوں مگر صبر نہیں ہوتا، بیشک آپ کے جانے کی صورت میں مجھے آپ کی ہلاکت کا اندیشہ ہے، بیشک اہل عراق (کوفی) غدار لوگ ہیں تو آپ ان کے دھوکہ میں نہ آئیں، لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے عراق (کوفہ) جانے کا پختہ ارادہ کرلیا ہے، تب ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ان کومشورہ دیا کہ:فإن کنت لا بد سائراً فلا تسر بأولادک ونساء ک، **فواللّٰہ إني لخائف أن تقتل کما قتل عثمان ونساؤہ و ولدہ ینظرون إلیہ.**

(ایضاً ص۱۶۰)

اگر آپ کا کوفہ جانا ضروری ہی ہے تو اپنی اولاد اور عورتوں کو نہ لے جایئے، اللہ کی قسم مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ قتل نہ کردیے جائیں جیسے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قتل کردیے گئے اس حال میں کہ ان کی عورتیں اور لڑکے دیکھ رہے تھے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کوفہ کے لیے روانہ ہوگئے، ابھی شاید نصف ہی سفر طے کرچکے تھے کہ ابن سعد رضی اللہ عنہ کا قاصد مسلم کے قتل اور کوفیوں کے دھوکہ دینے کی خبر لے کر آپ سے ملا، آپ نے رفتار حالات پرغور کیا، آخر فیصلہ یہ کیا کہ ''جب بیعت کرنے والے ہی دھوکا دے جائیں اور بے وفائی دکھائیں کہ حکومت کے دباؤ پر انھوں نے میرے وکیل مسلم رضی اللہ عنہ کو قتل ہونے کے لیے چھوڑ دیا تو وہ میرے ساتھ بھی ایسا ہی کریں گے، اس لیے اب کوفہ کا ارادہ بالکل فسخ۔ اب مجھے واپس ہی چلے جانا چاہیے۔''

یہ سوچ کر آپ نے واپسی کا ارادہ کیا، کوفی قاصدوں نے جب یہ دیکھا تو باتیں بنا کر پھر کوفہ چلنے کے لیے آپ کی خوشامدیں کیں، کہنے لگے ''نہیں آپ کوفہ ضرور چلیے، مسلم کی بات دوسری تھی، کوئی خاص بات ہی رہی ہوگی جو بیعت کرنے والے مسلم کی مدد نہ کرسکے ہوں گے۔ آپ کے لیے ہم سب بھی اور سب کوفہ والے بھی جان دے دیں گے''۔ (سیرت حضرت زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ ص۵۳)

مکہ سے نکلنے کے بعد سے کربلا پہنچنے تک چار مواقع ایسے آتے ہیں جہاں حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے لوٹنے کا ارادہ کیا، یا کہیں اور جانے کا عندیہ ظاہر کیا۔ ایک مرتبہ آپ نے اپنے ساتھیوں سے یہ کہا کہ ''جو واپس جانا چاہے واپس چلا جائے''۔ اور اس کے بعد راستے سے جتنے لوگ ساتھ ہوئے تھے سب واپس چلے جاتے ہیں۔

(تبصرہ بر''شہید کربلا و یزید'' ص۴۱-۴۰ بحوالہ ابن اثیر جلد۳ ص۲۷۸)

جب آپ کوفہ پہنچ گئے اور کوفہ والوں کی غداریوں کا حال معلوم کرلیا تو سفر کا رُخ بدل لیا اور یزید کی بیعت کے ارادے سے دمشق کی طرف روانہ ہوگئے، حافظ ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں: **فانطلق يسير نحو يزيد بن معاوية** (تبصرہ بر ''شہید کربلا و یزید ص ۴۱ بحوالہ ابن کثیر جلد ۸ ص ۱۷۰) ابھی آپ کربلا تک پہنچے تھے کہ کوفیوں نے آپ کو گھیر لیا''.........انھوں نے حسین رضی اللہ عنہ کو بلایا تھا کہ ان کا ساتھ دیں گے اور ان کو اپنا حاکم بنائیں گے، مگر وہ ان کے پاس پہنچے تو وہی لوگ ان پر ٹوٹ پڑے اور ان سے کہنے لگے کہ یا تو تم اپنا ہاتھ ہمارے ہاتھ میں دے دو تب تو ہم تم کو ابن زیاد بن سمیہ کے پاس صلح کے ساتھ بھیجیں گے کہ وہ تمھارے بارہ میں اپنا فیصلہ صادر کرلے اور یا تم ہم سے لڑو۔ خدا کی قسم حسین رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ وہ اور ان کے ساتھی لوگ کم ہیں اور وہ ایک بڑے مجمع میں گھر گئے ہیں۔

(سیرت حضرت زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ ص ۱۴۶-۱۴۵ بحوالہ طبری جلد ۶ ص ۲۷۳)

آپ نے ان لوگوں سے کہا کہ ''لوگو! میں خود نہیں آیا ہوں، بلکہ جب تمھارے قاصدوں نے آکر کہا اور اس مضمون کے خطوط آئے کہ آپ تشریف لایئے ہمارا کوئی امام و امیر نہیں ہے، تب آیا ہوں، اب اگر میرے آنے کو تم پسند نہیں کرتے ہو تو میں جہاں سے آیا ہوں وہیں لوٹ جاتا ہوں''۔

(تبصرہ بر ''شہید کربلا و یزید'' ص ۴۱ بحوالہ ابن اثیر جلد ۳ ص ۲۸۰)

آپ نے کوفہ والوں سے خدا اور اسلام کا واسطہ دلا کر یہ بھی فرمایا کہ:

''مجھے امیر المؤمنین یزید کے پاس روانہ کردو کہ میں اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دوں''۔

(ایضاً ص ۴۱ بحوالہ ابن کثیر جلد ۸ ص ۱۷۰)

جن کے دلوں میں روگ ہے وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بیعت یزید کے ارادے کو چھپاتے ہیں اور اس کا انکار کرتے ہیں حالانکہ چھ مورخین نے اس کو تسلیم کیا ہے۔(۱) ابن اثیر جلد ۴ ص ۲۴ (۲) اصابہ جلد ۲ ص ۱۷، (۳) طبری جلد ۶ ص ۲۳۵، (۴) البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۱۷۰، (۵) تاریخ الخلفاء ص ۱۴۰، (۶) راس الحسین ص ۲۰ (سیرت حضرت زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ ص ۵۴)

مختصر یہ کہ کوفیوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی کوئی بھی شرط ماننے سے انکار کردیا اور آپ نہایت بے دردی سے کربلا کے میدان میں بے یار و مددگار ظلماً شہید کردیے گئے۔

قاتل کون تھے؟ اس کی شہادت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے فرزند ارجمند، آپ کے مکہ سے کوفہ

تک کے ہم سفر، تمام واقعات کے عینی شاہد اور واقعہ کربلا کے سب سے معتبر راوی حضرت علی اصغر زین العابدین رضی اللہ عنہ کی زبانی سنیے:

احتجاج طبرسی ص ۱۵۷ میں ہے کہ امام زین العابدین نے اہل کوفہ سے فرمایا:

اے لوگو! میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں، بتاؤ تم جانتے ہو کہ تم لوگوں نے میرے والد کو خط لکھے اور ان کو فریب دیا اور ان کو عہد و پیمان دیے اور بیعت کی اور ان سے قتال کیا اور ان کا ساتھ نہ دیا، پس تمھارے لیے ہلاکت ہو، کیا برا سامان تم نے اپنے لیے جمع کیا ہے۔

(قاتلان حسین رضی اللہ عنہ کی خانہ تلاشی از مولانا عبدالشکور لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ)

یہی خط لکھ کر کربلا بلانے والے شیعہ، لشکرِ مخالف کی طرف سے میدان جنگ میں کام کر رہے تھے اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں پر تلوار چلا رہے تھے، احتجاج طبرسی ص ۱۵۶ میں ہے:

جب امام زین العابدین رضی اللہ عنہ عورتوں کے ساتھ کربلا سے چلے تو وہ بیمار تھے، دیکھا کہ اہل کوفہ کی عورتیں گریبان چاک کیے ہوئے ماتم کر رہی ہیں اور مرد بھی ان کے ساتھ رو رہے ہیں، تو امام زین العابدین علیہ السلام نے بہت کمزور آواز سے "بیماری نے انھیں کمزور کر دیا تھا"۔ فرمایا کہ یہ لوگ ہم پر رو رہے ہیں مگر ان کے سوا ہم کو قتل کس نے کیا ہے۔ (ایضاً ص ۶۲)

امام زین العابدین کو بعد قتل امام حسین رضی اللہ عنہ کے شیعوں نے فریب دینا چاہا، مگر انھوں نے ان کی کوئی بات نہیں سنی، خدا نے ان کو بچا لیا۔ احتجاج طبرسی ص ۱۵۷ میں ہے کہ جب شیعوں نے ان سے اپنی اطاعت و جاں نثاری کا اظہار کیا تو انھوں نے فرمایا:

فقال علی بن الحسین هیهات هیهات أیها الغدرة المکرة حیل بینکم وبین شهوات أنفسکم أتریدون أن تاتوا إلیّ کما أتیتم إلی اٰبائی من قبل کلا ورب الراقصات فان الحرج لما یندمل من قتل أبی بالامس.

ہیہات ہیہات اے غدار و مکارو، تمھاری مرادیں نہ پوری ہوں کیا تم چاہتے ہو کہ مجھے بھی فریب دو، جیسے تم نے میرے باپ دادا کو اس سے قبل فریب دیا۔ ہرگز نہیں قسم ہے گردش والے آسمانوں کے رب کی ابھی تک میرے والد کی شہادت کا زخم مندمل نہیں ہوا۔

امام زین العابدین اگر کہیں شیعوں کے فریب میں آجاتے تو امام حسین رضی اللہ عنہ کی نسل ہی کا خاتمہ ہوجاتا۔

(قاتلان حسین رضی اللہ عنہ کی خانہ تلاشی ص ۱۲۶ از امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی رحمۃ اللہ علیہ)

واقعہ کربلا کے عینی شاہد اور سب سے معتبر راوی کی ان شہادتوں کے بعد بھی یزید ہی کو قاتل سمجھنا شریعت اور عقل کی روشنی میں کہاں تک درست ہے؟ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا کوفہ جانا یزید کی ''عہد جاہلیت کی ملوکیت'' کے خلاف جہاد نہ تھا، بلکہ کوفیوں کا یہ کہنا کہ ''ہمارا کوئی امام اور امیر نہیں ہے'' کوفہ جانے کا محرک تھا اور ان کے خطوط کی بھرمار اس کی مؤید بنی۔ پھر انہی لوگوں نے کوفہ جانے پر آپ کو شہید بھی کردیا جس کی تفصیل اوپر گزر چکی، مکہ سے کوفہ تک کے سفر میں نہ تو کسی فرد نے یزید کے فسق وفجور کا ذکر کیا اور نہ ان کی طرف سے کسی ناخوشگوار واقعہ ظہور پذیر ہونے کا احتمال ہی ظاہر کیا، جیسے ہی آپ کوفہ پہنچے اور وہاں کے حالات کا مشاہدہ ہوا یزید سے بیعت ہونے کا ارادہ ظاہر کرکے گویا آپ نے اپنے سابقہ موقف سے رجوع فرمالیا، یہی وہ سیادت اور سرداری کی شان تھی جس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے بڑے بھائی حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ: **إن ابني هذا سيد ولعل الله ان يصلح به فئتين عظيمتين من المسلمين** (**میرا یہ بیٹا سید ہے امید ہے کہ اللہ اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے۔**) (مشکوٰۃ ''بحوالہ بخاری'' باب مناقب اہل بیت) وہ نہ تو یزید کو کافر وفاسق سمجھتے تھے اور نہ اس کی بیعت کو گناہ جانتے تھے، کیوں کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم بیعت کرچکے ہیں اور امت مرحومہ کبھی ضلالت پر مجتمع نہیں ہوسکتی۔ حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ اپنے والد محترم کے اس نقطۂ نظر کو خوب سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے نہ صرف یزید کے ہاتھ پر بیعت کی بلکہ ان کے مہمان بھی رہے اور ان سے وظائف بھی قبول کرتے رہے، امت مسلمہ کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے آخری عمل اپنے موقف سے رجوع اور ان کے فرزند حضرت علی زین العابدین رضی اللہ عنہ کے قول وعمل کو دیکھنا چاہیے اور اس کو اپنا مسلک ومشرب بنانا چاہیے، کسی فرد کا ''فسق یزید'' کو اپنی جماعت اور اپنے اکابرین کا متفق علیہ مسلک ومشرب قرار دے کر اس کو عقیدہ سے جوڑنا خود حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے فرزند علی اصغر زین العابدین رضی اللہ عنہ کے موقف ومسلک سے متصادم ہے۔

اسلامی کتب خانے

(بیسویں قسط)

از: دکتور علی بن علی ابو یوسف جہنی　　　ترجمہ و تلخیص: مسعود احمد الاعظمی

دمشق کا شفاخانۂ نوری:

اس کو الملک الصالح (نیک بادشاہ) کے نام سے مشہور سلطان نورالدین محمود زنگی -متوفی ۵۶۹ھ=۱۱۷۳ء- نے قائم کیا تھا، جس نے عراق، سیریا اور مصر کے علاقے پر حکومت کی تھی، سلطان نے اس شفاخانے کی چھٹی صدی ہجری کے وسط میں ۵۴۹ھ=۱۱۵۴ء میں دمشق میں داغ بیل ڈالی تھی[(۱)]۔

سلطان نورالدین کے نام پر ہی اس کا نام رکھا گیا، جب یہ شفاخانہ آباد ہو گیا تو علاج کی ذمہ داری طبیب ابوالمجد بن ابی الحکم -متوفی ۵۷۰ھ- کے سپرد کر دی گئی[(۲)]۔

نورالدین اس میں مریضوں کی عیادت کے لیے جایا کرتے، اور معالجوں اور مریضوں کے خدمت گاروں کے ساتھ بیماروں کی خبر گیری کرتے۔

جب یہ شفاخانہ بن کر تیار ہو گیا تھا تو یہ شرط لگا دی تھی کہ وہ فقراء اور مساکین پر وقف ہو گیا، لیکن اگر مال داروں کو بھی دواؤں کی حاجت ہو تو ان کے لیے بھی اجازت ہوگی[(۳)]۔

اس میں ہر مریض کو دوا و علاج مفت فراہم کرایا جاتا، چنانچہ جب مشہور سیاح ابن جبیر ۵۸۰ھ=۱۱۸۴ء میں دمشق وارد ہوا، تو اس عظیم الشان شفاخانے کو دیکھ کر دم بخود رہ گیا، جس کی عمارت شاہی محل کی عمارت سے زیادہ اونچی تھی، ابن جبیر نے اس شفاخانے کے مریضوں پر معالجین کی توجہ، ان

---

(۱) الوقف وبينة المكتبة العربية: ۱۰۷

(۲) من روائع حضارتنا: ۲۰۲

(۳) ایضاً: ۲۰۳

کی خبر گیری اور پرسش احوال اور دواؤں اور غذاؤں کی تیاری کا ذکر کیا ہے۔ اس شفا خانے میں دماغی امراض کا بھی ایک شعبہ تھا(۱)۔

اس شفاخانے کو دیکھنے کے لیے اسپین، مصر اور دوسرے شہروں سے لوگ آیا کرتے تھے، اس سے ہند، چین اور فارس ومصر وشام کے پچاس ماہرین وابستہ تھے، اس کی حیثیت معالجات کی تعلیم کے ایک طبی ادارے کی تھی(۲)۔

نورالدین زنگی نے طب کی کتابوں کی ایک بڑی تعداد اس شفاخانے پر وقف کی تھی، یہ کتابیں ہاسپٹل کی عمارت کے شروع کی دو لائبریریوں میں رکھی ہوئی تھیں، چنانچہ اطباء اور پیشۂ طب سے وابستہ افراد وہاں آتے اور طبیب ابوالمجد بن ابی الحکم کے پاس بیٹھتے، پھر طب کے تعلق سے بحثیں ہوتیں، ابوالمجد طلبہ کو پڑھاتے، اور تین گھنٹے تک ان کے بحث ومباحثہ، کتب بینی اور اس جیسے مشاغل میں مصروف رہتے(۳)۔

یہ شفاخانہ ۱۳۱۷ء تک عظیم الشان خدمت انجام دیتا رہا، مریضوں کے درد کا درماں بنا رہا، ان کا علاج کرتا اور ان کو مفت دوا اور غذا فراہم کرتا، یہاں تک کہ مستشفیٰ الغرباء (غریبوں کا ہاسپٹل) کا قیام عمل میں آیا، یہ وہی ہاسپٹل ہے جو دمشق کی سیرین یونیورسٹی کے ماتحت اس وقت کام کر رہا ہے۔

قاہرہ کا بڑا منصوری شفاخانہ:

اسلامی ممالک میں تعمیر کیے گئے شفاخانوں میں یہ سب سے بڑا اور سب سے مشہور شفاخانہ سمجھا جاتا تھا، اس کو شاہان مملوکیہ کے سلطان منصور سیف الدین قلاوون الفی صالحی -متوفیٰ ۶۸۹ھ= ۱۲۹۰ء- نے تعمیر کرایا تھا، اس کا قیام ۶۸۳ھ=۱۲۸۲ء میں ایک نذر (منت) کے نتیجے میں ہوا تھا جو اس نے ملک شام میں ایک بیماری سے شفا کے طور پر مانی تھی، ۱۲۷۵ء سلطان ظاہر بیبرس کے زمانے میں رومیوں سے جہاد کے لیے ایک لشکر کا سپہ سالار بن کر وہ شام گیا، وہاں جب وہ بیمار پڑا تو وہاں طبیبوں نے ایسی دواؤں سے اس کا علاج کیا جو شفاخانۂ نوری کبیر سے حاصل کی گئی تھیں، علاج سے وہ اچھا ہو گیا، پھر خود اسپتال جا کر اس کا مشاہدہ اور معاینہ کیا، اور اسے بہت پسند کیا، اور یہ نذر مانی کہ اللہ

(۱) الرحلة: ۲۳۰

(۲) البيمارستانات الإسلامية في العصور الوسطىٰ / مجلة التراث العربي، صفر ۱۴۰۶ھ ص: ۲۰۰

(۳) عيون الأنباء: ۲/۱۵۵

نے اگر اس کو حکومت عطا کی تو وہ بھی اس جیسا اسپتال تعمیر کرائے گا[۱]۔

چنانچہ جب وہ مصر واپس ہوا اور اس کے ہاتھ میں زمام حکومت آئی تو اس نے اپنی نذر کو پورا کرنا شروع کیا، اس نے ایک امیر کا مکان خریدا اور اس کو شفاخانے میں تبدیل کر دیا، جو بعد میں ''شفاخانۂ قلاوون'' کے نام سے مشہور ہوا۔

جب اس کی تعمیر مکمل ہوگئی تو سلطان نے تقریباً ایک ہزار کی اپنی کچھ مملوکہ چیزیں اس پر وقف کر دیں، اس کے اخراجات کا انتظام کیا اور عام لوگوں کے واسطے اس کو کھول دیا، اسی طرح دواؤں، طبیبوں اور مریضوں کے خدمت گاروں کا انتظام کیا، بستروں کا بندوبست کیا، اور ہر وہ چیز مہیا کی جس کی مریض کو ضرورت پیش آتی ہے[۲]۔

سلطان قلاوون نے اس شفاخانے کے ساتھ ایک درسگاہ بھی تعمیر کرائی، اور ایک بڑا ہال بنا کر اس کے لیے عظیم الشان کتب خانہ وقف کر دیا[۳]۔

اس کے لائبریرین کے لیے ۴۰ درہم مشاہرہ مقرر کیا، اس کتب خانے میں قرآن کریم کے بہترین نسخے تھے، اسی طرح مشہور خطاطوں کے نقل کیے ہوئے قرآن کریم کے پارے تھے، کتب تفسیر وحدیث، فقہ واصول اور ادب وطب اور شعری مجموعے تھے، اس طرح یہاں کتابوں کا ایک بڑا کلیکشن وجود پذیر ہو گیا تھا، کہا جاتا ہے کہ مستشفی قلاوون کی کتابوں کی تعداد ایک لاکھ کے قریب تھی، ان میں سے بیشتر کتابیں قاہرہ کے دارالحکمت سے حاصل کی گئی تھیں[۴]۔

یہ شفاخانہ اسلامی مملکت میں تعمیر کیے گئے بہترین شفاخانوں میں تھا، انتظام وانصرام اور نظم ونسق میں بدرجۂ اتم تھا، اس کے ساز وسامان، بستر اور کپڑے وغیرہ محلات میں استعمال ہونے والے سامانوں کی طرح آرام دہ اور قیمتی تھے۔

مقریزی نے لکھا ہے کہ سلطان قلاوون نے اس اسپتال کے اندر مریضوں کی ہر قسم کے لیے ایک خاص حصہ مقرر کر رکھا تھا، یعنی اس نے اس میں مختلف شعبے بنا رکھے تھے، چنانچہ آشوب چشم کی

---

(۱) فلپ هٹی / تاریخ العرب: ۲/ ۸۰۲
(۲) تاريخ البيمارستانات في الإسلام: ۸۶–۸۷
(۳) خطط مقریزی: ۲/۴۰۷
(۴) دائرة المعارف الاسلامية: ۳/۳۶۱

بیماری کا شعبہ الگ تھا، بخار کا الگ تھا، سرجری کا شعبہ علاحدہ تھا، پوشیدہ امراض کا ان سے جدا تھا، امراض نسواں کا الگ تھا، ہر جگہ پانی کا انتظام تھا، دواسازی کی جگہ کے علاوہ کھانے پینے کی تیاری کے لیے مطبخ قائم کیا تھا[1]۔

اس بات پر زور دیتے ہوئے کہ- علاج کے اہتمام کے ساتھ ساتھ- اس شفاخانے میں تعلیم وتدریس کا بھی اہتمام تھا، مراجع یہ ذکر کرتے ہیں کہ اطباء کا صدر اس کے اندر طب کا درس دیا کرتا تھا، اور اوپر لکھا جا چکا ہے کہ اس شفاخانے کا ایک کتب خانہ تھا جو طب وغیرہ کی قیمتی کتابوں اور بیش قیمت طبی کاموں پر مشتمل تھا، علم طب کے جو طلبہ چاہتے اس سے استفادہ کرتے اور اپنی معلومات میں اضافہ کرتے[2]۔

اس شفاخانے کو وقف کرنے والوں کی بھی توجہ حاصل رہی، ان ہی میں سے ایک مشہور تر کی طبیب علاء الدین بن علی بن ابی الحزم قرشی دمشقی- متوفی ۶۸۷ھ = ۱۳۸۹ء- تھے جو ابن النفیس کے نام سے مشہور تھے، اور جنھوں نے دوران خون کا نظام blood circulation system دریافت کیا تھا، جو اس شفاخانے میں کام کرنے والوں میں سے ایک تھے اور ان پر فن طب کی ریاست کا خاتمہ ہو گیا تھا، انھوں نے اپنا گھر اور اپنی کتابیں اور اس سے متعلق تمام چیزیں اس کتب خانے پر وقف کر دی تھیں[3]۔

جن کتابوں کو اس نے اس پر وقف کیا تھا ان میں ''الشامل فی الطب'' بھی تھی، یہ ایک بلند پایہ کتاب تھی، جس کی فہرست سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تین سو جلدوں پر مشتمل تھی، اس کی ۸۰ جلدوں کی اس نے تبییض کی تھی، مقریزی نے لکھا ہے کہ: ان میں سے بیشتر کتابیں ضائع ہو گئیں، اور لوگوں کے ہاتھوں میں بکھر گئیں، اور بعد میں اس شفاخانے کا کتب خانہ آتش زدگی کی نذر ہو گیا، جس میں تمام کتابیں، قرآن کریم کے نسخے، اور رجسٹر وغیرہ جل کر ختم ہو گئے[4]۔

یہ شفاخانہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر تک مصر پر فرانسیسی حملے (نپولین بوناپارٹ کے

(۱) خطط مقریزی: ۴/۲۶۰

(۲) النظم والحضارة الإسلامية: ۲۵۹

(۳) الوقف وبينة المكتبة العربية: ۱۰۷

(۴) خطط مقریزی: ۲/۳۸۰

حملے) کے وقت تک علاج کی خدمت انجام دیتا رہا، اس حملے میں شریک ایک قلم کار شخص نے جس کا نام ''جومار'' تھا اس اسپتال کا حال ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ: قاہرہ میں چھ سات صدی پہلے متعدد اسپتال تعمیر کیے گئے جس میں دونوں صنفوں کے مریض اور بیمار آتے تھے.......... اور قاہرہ کا یہ شفاخانہ سب سے زیادہ شہرت کا حامل رہا، آخر میں اس نے شفاخانے کا حال اور اس کے کمروں، ہالوں اور طبیبوں کا بیان کیا ہے [(۱)]۔

خاتمہ:

مذکورہ بالا گفتگو سے ابتدائی عہد میں شفاخانوں کی تعمیر سے مسلمانوں کی دلچسپی واضح ہوتی ہے، اور اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اس میدان میں دوسری بہت سی قوموں پر سبقت حاصل ہے، ان شفاخانوں کا پھیلاؤ مسلمانوں میں طبی تعلیم کی اشاعت وترقی کا بہت بڑا رول سمجھا جاتا ہے۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کو سوسائٹی کے افراد کی صحت وتندرستی کی کس قدر فکر رہا کرتی تھی، شفاخانوں کی تعمیر کی یہ عظیم الشان سرگرمی اور لوگوں کے آلام ومصائب کی تخفیف میں طب اور اطباء کے مؤثر کردار کا یہ نتیجہ تھا کہ ایک بہت بڑی تعداد اس مفید علم کی تحصیل کی طرف متوجہ ہوگئی، اس علم کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول ہونے کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ لوگوں نے دیکھا کہ طبیبوں کو صرف عوام ہی میں نہیں بلکہ حکام، خلفاء اور سلاطین کی نگاہ میں ایک خاص مقام حاصل ہے، اور یہ حکام وخلفاء طبیبوں پر اپنا مال بہایا کرتے ہیں۔

سابقہ تفصیلات اس خاص قسم کے کتب خانوں کے قیام میں مسلمانوں کی دلچسپی اور فکرمندی کو بھی اچھی طرح ظاہر کرتی ہیں، یعنی شفاخانوں اور اسپتالوں کے کتب خانے جن کو عصر حاضر کی اصطلاح میں میڈیکل لائبریری کہا جاتا ہے۔

اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ ان مسلمانوں نے ان کتب خانوں کے لیے کتابوں کے بہت سے ذخیرے فراہم کیے، جو صرف طب نہیں، بلکہ بہت سے دوسرے فنون کی تصانیف وتالیفات پر مشتمل تھی۔ بقیہ صفحہ ۴۷ پر

---

(۱) تاریخ البیمارستانات في الإسلام: ۱۰۱

وفیات

مسعود احمد الاعظمی

حضرت مولانا محمد یونس جون پوری رحمۃ اللہ علیہ

۱۶/شوال ۱۴۳۸ھ مطابق ۱۱/جولائی ۲۰۱۷ء کو مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور کے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس جون پوری رحمۃ اللہ علیہ کے سانحۂ ارتحال سے علم وعمل اور درس وافادہ کی دنیا کا جو نقصان ہوا ہے، اس کی تلافی آسانی سے ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی، مولانا مرحوم کے علم میں جو گہرائی، مطالعہ میں وسعت اور تحقیق وجستجو کا جو ذوق تھا وہ اب عام طور پر ختم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اب گہرائی کہ جگہ سطحیت، وسعت مطالعہ کی جگہ کم علمی اور تلاش وتحقیق کی جگہ تساہل اور راحت پسندی آتی جا رہی ہے۔ اختراع وایجاد کی کثرت وبہتات اور عصر حاضر کی سہولیات نے علمی وتحقیقی لیاقت وصلاحیت کے انحطاط کو مزید تیز رفتار بنا دیا ہے۔ بحث وتحقیق اور طلب وتحصیل کے وسائل وذرائع میں تو ماضی کے مقابلے میں آج نہ جانے کتنا گنا اضافہ ہو گیا ہے، لیکن اس ظاہری ترقی کے باوجود استعداد وصلاحیت کے انحطاط کا ماتم کوئی جگہ اور کوئی ادارہ ودرس گاہ نہیں ہے، جہاں زور وشور سے نہ کیا جاتا ہو۔ ان حالات میں جو قدیم طرز کے حامل علماء بقید حیات ہیں وہ بسا غنیمت ہیں، اور جو اپنی مسندیں خالی کر چکے ہیں، اس سے واقع ہونے والے خلا کے پُر ہونے کا امکان کم ہی نظر آتا ہے۔ اس بنا پر حضرت شیخ یونس جون پوری کے انتقال سے علمی دنیا کو جو خسارہ ہوا ہے، بلاشبہ وہ غیر معمولی ہے۔

مولانا کا اصلی وطن تو جونپور تھا، جہاں ان کی ولادت، نشو ونما اور ابتدائی تعلیم ہوئی، لیکن انھوں نے پہلے تحصیل علم پھر درس وتدریس کے تعلق سے پوری زندگی سہارن پور میں گزاری، وہیں رہگرائے عالم آخرت اور بالآخر اسی کی خاک کا پیوند ہوئے۔

مولانا کی تاریخ پیدائش ان کے خود نوشت مرقع کے اعتبار سے ۲۵/رجب ۱۳۵۵ھ مطابق ۲/اکتوبر ۱۹۳۷ء ہے۔ مولانا کے علمی افادات موسوم بہ ''الیواقیت الغالیۃ'' مرتبہ مولانا محمد ایوب سورتی

میں ''ایک خودنوشت مرقع'' کے عنوان کے تحت ان کی تاریخ ولادت یہی درج ہے جو ہم نے لکھی ہے (۱)، لیکن معلوم ہوتا ہے اس میں کہیں سے وہم یا سہو ہوا ہے۔ ہماری تلاش کے لحاظ سے ۲۵/رجب ۱۳۵۵ھ کی مطابقت ۲/اکتوبر سے ہے نہ ۱۹۳۷ء سے، بلکہ اس کے مطابق ۱۲/اکتوبر ۱۹۳۶ء ہے۔

مولانا کا آبائی وطن چوکیہ (گورینی) یا کھیتا سرائے جون پور ہے، جس کی آب وہوا میں انھوں نے پرورش پائی اور بچپن کا بیشتر حصہ گزارا۔ ابتدائی تعلیم گاؤں اور اس کے اطراف میں حاصل کی، تقریباً ۱۳/سال کی عمر میں مدرسہ ضیاء العلوم قصبہ مانی کلاں میں داخل ہوکر ابتدائی فارسی سے لے کر سکندر نامہ تک اور ابتدائی عربی سے لے کر متوسطات کی تعلیم حاصل کی۔

شوال ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۸ء میں مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور میں داخلہ لے کر ۱۳۸۰ھ = ۱۹۶۱ء میں تحصیل علم سے فراغت حاصل کی، بخاری شریف آپ نے اپنے شیخ ومرشد شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب نوراللہ مرقدہ سے پڑھی۔

فراغت کے بعد ایک سال مظاہر علوم میں رہ کر کچھ اور کتابوں کی تکمیل کی۔ شوال ۱۳۸۱ھ میں معین مدرس کی حیثیت سے وہیں تقرر ہوگیا، تدریسی میدان میں ترقی کرتے کرتے شوال ۱۳۸۸ھ = ۱۹۶۸ء میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے، اور اس وقت سے لے کر شوال ۱۴۳۸ھ تک ہندوستان کے اس اہم ادارے میں تقریباً پچاس سال بخاری شریف کا درس آپ سے متعلق رہا اور اپنی محنت، لگن اور جد وجہد سے روز بروز ترقی کی منزلیں طے کرتے رہے، اور علم دین خاص طور سے فن حدیث میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ آپ کی شہرت حدود ہند سے تجاوز کر کے بیرون ہند تک پہنچی، اور تشنگان علم کی بڑی تعداد نے آپ سے کسب فیض کیا۔

تحصیل علم اور سلسلۂ درس وتدریس کے ساتھ تصوف وسلوک سے بھی رشتہ استوار رکھا، اور فراغت کے چند سال بعد ۱۳۸۶ھ میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کے دست مبارک پر بیعت ہوگئے۔

---

(۱) غالباً اسی پر اعتماد کرتے ہوئے بعض دوسرے مضمون نگاروں نے اپنے اپنے مضمون میں یہی تاریخیں درج کی ہیں، مثال کے طور پر دیکھیے ماہنامہ مظاہر علوم سہارن پور اور ضیاء علم حیدرآباد کے اگست ۲۰۱۷ء کے شمارے، جن کے اندر مولانا مرحوم کے حالات، ان کے علمی وعملی کارناموں اور منہج فکر کو قدرے تفصیل سے قلم بند کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مولانا ایک وسیع المطالعہ، ذہین وفطین اور متبحر عالم تھے، درس وتدریس کے ساتھ ساتھ شوق مطالعہ اور کتابوں میں انہماک آپ کا خاص وصف تھا، کتابوں کے شیدائی اور دل دادہ تھے، اور بیش قیمت متاع سمجھ کر ان کی حفاظت کا اہتمام کیا کرتے تھے، ان کے بعض شاگردوں سے کتابوں سے تعلق اور ان کے شوق کے بہت سارے واقعات سنے ہیں، جن سے ان کی شیفتگی اور فریفتگی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، وسعت معلومات کے ساتھ بداہت واستحضار بھی آپ کے امتیازی اوصاف میں سے تھا۔

مولانا کا خمیر پورب کی خاک سے تیار ہوا تھا، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ مولانا کا پورب سے، یا اہل پورب کا ان سے وہ لگاؤ یا تعلق اس خاکسار کو نظر نہیں آیا، جو کسی علاقے کے لوگوں کا وہاں سے تعلق رکھنے والی کسی بڑی شخصیت کے ساتھ ہوتا ہے۔ مجھے نہیں یاد ہے کہ پورب کے مدارس یا دینی اداروں میں، یا علم ودین کے نام پر برپا ہونے والی تقریبات کے مدعوئین یا مہمانوں میں ان کا نام آتا رہا ہو، اس کے برعکس خطۂ گجرات وغیرہ میں ان کے نام کا طوطی بولتا تھا، وہاں کے بیشتر مدارس میں اور خاص طور سے ختم بخاری شریف وغیرہ کی تقریبات میں مولانا رونق افروز ہوتے تھے، اور ان کے اندر مولانا کی شرکت باعث شرف وسعادت سمجھی جاتی تھی، الغرض آپ کے علوم ومعارف سے فائدہ زیادہ تر اُن ہی علاقے کے لوگوں نے اٹھایا، اور آپ کے اپنے خطے میں آپ کی زندگی میں آپ کا فیض ویسا عام نہیں ہوا جیسا ہونا چاہئے تھا۔

راقم الحروف سے متعدد لوگوں نے حضرت مولانا یونس صاحب کے حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق کے بارے میں سوال کیا، حقیقت یہ ہے کہ حضرت سے ان کے تعلق کے بارے میں راقم کو کچھ پتہ نہیں تھا، نہ کبھی آپ کی خدمت میں مئو حاضر ہوتے ہوئے دیکھا، نہ اس کا علم ہوا، جب کہ حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے وقت کے اکثر علماء، -خواہ وہ آپ کے ہم عمر رہے ہوں یا چھوٹے بلکہ عمر میں بہت سے بڑے علماء بھی- آپ سے اکتساب واستفادہ کا تعلق رکھا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں راقم نے اپنے خال محترم اور حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی دام ظلہ سے استفسار کیا تو آپ نے فرمایا کہ کبھی کبھار کسی اشکال کے بارے میں خط لکھ کر دریافت کیا تھا۔ احقر کا خیال ہے کہ دیوبند کے اجلاس شوری وغیرہ کے سفر کے موقع پر سہارن پور بھی کبھی کبھی حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا جانا ہوتا تھا، ہوسکتا ہے مولانا محمد یونس صاحب ان مواقع سے فائدہ اٹھا

کر حاضر خدمت ہوتے رہے ہوں۔ ہاں دارالعلوم مئو کے استاد مولانا عقیل احمد صاحب قاسمی کی روایت ہے کہ وہ ایک دفعہ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے ان کے پوچھنے پر اپنا وطن مئو بتایا، تو فرمایا کہ ساری دنیا پریشان ہے ما المئو ؟ ماالمئو ؟تو انھوں نے (مولانا عقیل احمد نے) کہا کہ اصل میں صنعتی جگہ ہے، وہاں ساڑیاں بنتی ہیں۔ شیخ نے فرمایا کہ ''چپ تو رہو، اگر مولانا حبیب الرحمٰن نہ ہوتے تو مئو کو کون جانتا''۔

راقم الحروف کو مولانا کی مستقل تصانیف کا تو علم نہیں ہے، لیکن ان کے علمی افادات وتحقیقی کاوشوں پر مشتمل **الیواقیت الغالیة فی تحقیق وتخریج الأحادیث العالیة** کے نام سے چار جلدوں میں ایک کتاب خاکسار کے پیش نظر ہے، جس میں انھوں نے بہت سارے معرکۃ الآراء اور مشکل مسائل سے متعلق اہل علم کے سوالات کے نہایت جدو جہد اور کوشش وکاوش کے ساتھ جوابات سپرد قلم کیے ہیں، اور اس طرح داد تحقیق دی ہے کہ ان افادات سے معلومات ایک بیش قیمت ذخیرہ اکٹھا ہو گیا ہے، جن کے مطالعہ کے بعد کوئی شخص مولانا کی وسعت معلومات، ذوق تحقیق وجستجو اور ان کے علم وفضل کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

خاکسار اپنی محرومی کہہ سکتا ہے کہ اس کو مولانا سے استفادہ حتی کہ زیارت کا بھی موقع میسر نہیں آیا، ہندوستان کا عام مزاج ''مردہ پرستی'' کا ہے، کہ کسی شخصیت کی قدر اس کی حیات میں نہیں ہوتی، البتہ جب وہ دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے، اور سربستہ راز کی طرح اس کے علمی مقام سے پردہ اٹھتا ہے، تو کف افسوس ملا کرتے ہیں، ہمارا حال بھی اس وقت اسی طرح افسوس کے ساتھ، ہتھیلی ملنے والوں جیسا ہے۔

ایک بات جو مولانا کی شخصیت سے متعلق ہمیشہ کھٹکتی رہی ہے، وہ ان کے بارے میں پھیلی ہوئی عام روایت ہے کہ ان کا رجحان ظاہر حدیث پر عمل کی طرف تھا، یہی وجہ ہے کہ حنفی ہوتے ہوئے، اور مظاہر علوم جیسے متصلب حنفی ادارے کے شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہتے ہوئے حنفی مذہب کے خلاف عمل کرنا ان کی طرف منسوب اور مشہور ہے، اسی وجہ سے خود مظاہر علوم کے بعض ذمہ داروں کے بارے میں سنا گیا ہے کہ وہ مولانا مرحوم کے اس طرز عمل سے خوش نہیں تھے، اور اس صورت حال سے وہ کبیدہ خاطر رہا کرتے تھے۔ اگر یہ صحیح ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا

صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شاگرد اور تربیت یافتہ اور مظاہر علوم کے فیض یافتہ ہوتے ہوئے ان کا یہ ذہن کیسے بنا، جب کہ حنفی مسلک میں قرآن وسنت پر عمل اور مختلف روایات کے درمیان تطبیق کی جو شان پائی جاتی ہے، دوسرے کسی مسلک میں وہ بات نہیں پائی جاتی۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا کی وفات سے ایک بہت بڑا علمی خلا پیدا ہو گیا ہے۔ اور علمی وتدریسی دنیا کا بہت غیر معمولی نقصان ہوا ہے۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے، اور جنت الفردوس میں بلند مقام عطا فرمائے، اور امت کو نعم البدل عطا فرمائے، آمین۔

....

بڑے ابا کی وفات

۱۶؍محرم ۱۴۳۹ھ مطابق ۸؍اکتوبر ۲۰۱۷ء بروز یکشنبہ سحر کے وقت راقم کے بڑے والد حاجی عبدالغنی صاحب سفر آخرت پر روانہ ہو گئے إنا لـلّٰـه وإنا إليه راجعون، ان کو کئی برسوں سے قلب کا عارضہ تھا اور گزشتہ چند مہینوں سے مختلف امراض وعوارض میں مبتلا رہے، بلکہ رمضان المبارک سے کئی دفعہ کسی کسی مرض کے شدت اختیار کر لینے کی وجہ سے کبھی مئو اور کبھی بنارس کے اسپتالوں میں ان کو داخل کیا جاتا، جب کبھی کچھ افاقہ ہو جاتا تو رخصت کرا کر گھر لائے جاتے، لیکن چند ہی دنوں کے بعد پھر اسپتال لے جانے کی نوبت آ جاتی، ۶؍اکتوبر کو جمعہ کے وقت اسپتال سے رخصت کرا کر گھر لے آیا گیا تھا، اور بظاہر طبیعت اطمینان بخش تھی، کہ اچانک ۷؍اکتوبر کی دوپہر سے اضمحلال اور سستی ہو گئی، اور ۸؍اکتوبر کا سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے ان کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا۔

فرائض کی پابندی کے علاوہ ان کو قرآن کریم کی تلاوت کا بہت اہتمام تھا، راقم نے اتنا زیادہ قرآن کریم کی تلاوت کرنے والا کم لوگوں کو دیکھا ہے، ان کی تلاوت کا کوئی وقت متعین نہیں تھا، جب موقع میسر ہوتا قرآن شریف ہاتھ میں لے کر تلاوت شروع کر دیتے۔ اسی طرح معاملات کی صفائی کا بڑا اہتمام تھا، کاروباری لین دین میں آنا پائی کا حساب صاف کرنے کے قائل تھے۔ پسماندگان میں تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں، بڑے صاحبزادے عزیزم مولوی عقیل احمد صاحب

دارالعلوم مئو میں مدرس اور مرزاہادی پورہ جامع مسجد میں امام وخطیب ہیں، اللہ سے دعا ہے کہ جانے والے کی مغفرت فرمائے، ان کی حسنات کو قبول فرمائے، سیئات سے درگزر فرمائے، اور باغ فردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔

....

آغوش مادر آغوش رحمت میں

آج یہ لکھتے ہوئے قلم کانپ رہا ہے، دل خون کے آنسو رو رہا ہے اور کلیجہ منھ کو آرہا ہے کہ اس عالم آب وگل میں میرے لیے سب سے بڑی نعمت پیکر محبت وشفقت، سراپا لطف وکرم وعنایت، ہمارے تھوڑے سے راحت وآرام کے لیے ہزارہا مصیبتیں اور کلفتیں برداشت کرنے والی والدہ محترمہ ۲۲ر محرم ۱۴۳۹ھ مطابق ۱۳ر اکتوبر ۲۰۱۷ء بروز جمعہ شام کے تقریباً چار بجے عین عصر کی نماز کے وقت مختصر سی علالت کے بعد اس عالم فانی سے حیات جاودانی کے سفر پر روانہ ہوگئیں، إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون.

انتقال سے دس دن پہلے عاشوراء کے ایک دن بعد والدہ محترمہ کو لرزہ کے ساتھ بخار آیا، ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کا کاسۂ عمر لبریز ہو چکا ہے، چنانچہ دوا وعلاج کے بعد افاقہ بھی ہوگیا، لیکن غیر معمولی طور پر کمزوری اور نقاہت وغیرہ کا احساس ہونے لگا، تو ایک پرائیویٹ اسپتال میں لے جاکر چیک اپ کرایا گیا، بلڈ پریشر اور پلیٹ لیٹ میں کافی کمی پائی گئی، فوری علاج سے بلڈ پریشر میں تو بہتری ہوگئی لیکن پلیٹ لیٹ کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ڈاکٹر نے بنارس ریفر کردیا، وہاں حالت کافی بہتر ہوگئی اور ایک ہی دن کے بعد ڈاکٹر نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے ڈسچارج کردیا، یکشنبہ ۸ر اکتوبر کو بنارس سے بذریعہ ایمبولنس مئو لاتے ہوئے راستے ہی سے بے خبری کی کیفیت طاری ہوگئی، اور اس طرح کی باتیں بولنے لگیں جس سے یہ خوف محسوس ہونے لگا کہ ان کے جانے کا وقت قریب آرہا ہے، ۱۰ر اکتوبر سہ شنبہ کی صبح سے سانس میں تکلیف اور کوما کی سی حالت طاری ہوگئی، اسپتال لے جایا گیا جہاں سانس کے نظام کو درست رکھنے کے لیے آکسیجن لگایا گیا، مگر درحقیقت اب وہ چراغ سحری ہو چکی تھیں، اور اتنے دنوں تک موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا رہ کر ۲۲ر محرم = ۱۳ر اکتوبر کا سورج غروب ہونے سے پہلے وقت موعود آپہنچا اور جان جان آفریں کے سپرد

کردی۔ انتقال کے وقت عمر عزیز ستر سال سے متجاوز تھی۔ خال محترم مخدوم گرامی قدر حضرت مولانا رشید احمد صاحب دامت برکاتہم سے نماز جنازہ پڑھانے کے لیے درخواست کی گئی، اور دوسرے روز صبح کے دس بجے ان کی امامت میں ایک جم غفیر نے نماز جنازہ ادا کی، اور نہ صرف مئوشہر، بلکہ قرب وجوار کے قصبات سے بھی بڑی تعداد میں لوگوں نے نماز جنازہ اور تدفین میں شرکت کی۔

والدہ مرحومہ، محدث جلیل حضرت علامہ ومولانا الاعظمی ؒ کی تمام اولاد میں سب سے چھوٹی اور انتہائی سعادت مند تھیں، اس کی وجہ سے فطری طور پر ان سے انس ومحبت زیادہ تھی، اور اس کا وقتاً فوقتاً ظہور بھی ہوا کرتا تھا، ایک دفعہ احقر حضرت ؒ کی خدمت میں حاضر تھا، وہاں حضرت الاستاذ مولانا عبدالجبار صاحب ؒ بھی تشریف رکھتے تھے، آپ نے حضرت مولانا عبدالجبار صاحب سے فرمایا کہ ''مولوی عبدالجبار! عبیدہ (والدہ مرحومہ) سے میرا دل بہت خوش رہتا ہے، اس کی عمر کی تمام عورتیں کالا نقاب لگانے لگی ہیں لیکن وہ سفید برقع اوڑھتی ہے''۔ یعنی وہ برقع جو سفید، کشادہ اور بہت ڈھیلا ڈھالا ہوتا تھا، جس میں جسم کا کوئی حصہ ظاہر نہیں ہوتا تھا۔

والدین کی تربیت اور گھریلو ماحول کا اثر تھا کہ والدہ بچپن ہی سے نیک، صالح اور پابند صوم وصلاۃ تھیں، ہم نے جب سے آنکھ کھولی ہے ان کو عبادت کا پابند پایا ہے، پھر ہم بھائیوں کی شادی کے بعد جب ان کو خانگی امور سے آزادی حاصل ہوگئی، تو شب وروز کے زیادہ تر اوقات عبادت ہی میں گزرتے تھے، برسہابرس سے یہ معمول تھا کہ آخر شب میں تہجد کے لیے جب مصلی پر جاتی تھیں، تو تہجد سے فراغت کے بعد نماز فجر اور اشراق وغیرہ پڑھ کر مصلی سے اٹھتی تھیں، اور عصر کی نماز کے لیے مصلی پر جاتیں تو مغرب پھر عشاء سے فراغت کے بعد وہاں سے اٹھتیں، ان نمازوں کے درمیان تلاوت اور اوراد ووظائف میں مشغول رہتیں۔

سال کے نفلی روزے بھی اہتمام سے رکھا کرتی تھیں، اس سال بھی عاشورا کا روزہ (نویں اور دسویں محرم کے روزے) رکھا اور اس کے ایک ہی دن بعد سے مرض الموت میں گرفتار ہوگئیں، اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ ان کے لیے **للصائم فرحتان: فرحة عند فطره، وفرحة عند لقاء ربـه** (روزہ دار کے لیے دو خوشی ہے، ایک خوشی اس کے افطار کے وقت اور دوسری اپنے پروردگار سے ملاقات کے وقت) کا مژدۂ خداوندی ظہور پذیر ہورہا ہوگا۔

فطرتاً کم گو اور خاموش طبع تھیں، شکوہ شکایت اور غیبت تو شاید ہی کبھی زبان پر آتی رہی ہو، اولاد کی تربیت اور ان کے کردار سازی کے لیے ہمیشہ فکرمند رہا کرتی تھیں۔

دنیا میں والدین کا حق نہ کبھی کسی سے ادا ہوا ہے نہ ہوسکتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ ہم پانچ بھائی اور تین بہنیں ان کے کسی بھی حق کی ادائیگی سے قاصر اور کوتاہ رہے، لیکن دل کو یہ سوچ کر کچھ اطمینان ہو جاتا ہے کہ ہم بھائی بہنوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ والدہ کو اگر آرام نہیں پہنچا سکتے تو کم از کم ہماری ذات سے ان کو کوئی اذیت اور تکلیف نہ پہنچے، خدا جانے ہم اپنی اس کوشش میں کامیاب رہے یا نہیں رہے، لیکن بظاہر وہ آخرت تک ہم سے راضی ہی رہیں۔ اسی طرح ہماری بیویوں نے بھی بحمداللہ ہمیشہ ان کے راحت و آرام کا خیال رکھا۔ اللہ سے دعا ہے کہ ان کی بال بال مغفرت فرمائے، کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، ان کے ساتھ اپنے ان مقرب بندوں جیسا معاملہ فرمائے جن کے بارے میں اس پروردگار عالم نے خود فرمایا ہے: (**يـا أَيَّتُهـا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ، ارْجِعِيْ اِلـيٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّـرْضِيَّةً، فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ، وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ**) (ترجمہ: اے نفس مطمئنہ! تو اپنے پروردگار کی طرف واپس چل، اس حال میں کہ تو اللہ تعالیٰ سے راضی ہے اور اللہ تعالیٰ تجھ سے راضی ہیں، پس تو میرے خاص بندوں (کی جماعت) میں داخل ہو جا اور میری جنت میں پہنچ جاؤ) اور ان ہی کے ہمراہ ہم سب کو بھی جنت میں داخل فرمائے، آمین یارب العالمین۔

آسماں ''ان کی'' لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

....

ایک اور سانحہ

راقم الحروف کے گھر پے در پے تین بڑے حادثوں نے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، اور صدائے بازگشت کی طرح فارسی شاعر کا یہ قطعہ دماغ کے دریچوں میں گونجنے لگا کہ:

ہر بلائے کہ ز اسماں آید گرچہ بر دیگرے قضا باشد
بر زمیں نا رسیدہ می پرسد خانۂ انوری کجا باشد

ڈیڑھ مہینے سے بھی کم کے عرصے میں تین گھنے سائے سے ہم محروم ہو گئے، دو حادثوں کی

تفصیل گزر چکی، تیسرا سانحہ راقم کے ایک اور بڑے والد حاجی حبیب احمد صاحب کی وفات کا ہے، جو ۲۷ر صفر ۱۴۳۹ھ مطابق ۱۷ر نومبر ۲۰۱۷ء کو جمعہ کے روز صبح کے تقریباً آٹھ بجے پیش آیا، إنا للہ و إنا إلیہ راجعون.

مرحوم کئی سال سے علیل تھے، اور گزشتہ ایک برس سے تقریباً بالکل صاحب فراش تھے، عمر بھی تقریباً پچاسی سال ہو چکی تھی، بیماری اور پیرانہ سالی نے مل کر ہڈی اور چمڑے کا ڈھانچہ بنا دیا تھا، گزشتہ ایک برس کے دوران کئی بار حالت سنگین ہوئی، مگر پھر طبیعت میں کچھ سدھار ہو جاتا، بالآخر وقت مقرر پر جان جان آفریں کے سپرد کر دی، اور اسی دن بعد نماز جمعہ شاہی کٹرے کے میدان میں ایک جم غفیر نے نماز جنازہ ادا کر کے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کر دیا۔

بڑے والد دیندار اور پابند شرع ہونے کے ساتھ نہایت محنتی، جفاکش اور جہد مسلسل کرنے والے تھے، ان کی زندگی عمل پیہم کا مصداق تھی، وہ جب تک صحت وتندرستی کے ساتھ اور چلنے پھرنے کے قابل رہے، متحرک وفعال اور چاق و چوبند رہے، جمعیۃ علماء ہند کے انتہائی مخلص اور وفادار خادم اور کارکن تھے، اور موافق ومخالف کی پروا کیے بغیر اس کی خدمت کے لیے ہر وقت مستعد اور تیار رہا کرتے تھے، اس کے کاموں، پروگراموں اور تحریکوں میں دل وجان سے اور پوری سرگرمی کے ساتھ حصہ لیتے، اس کے لیے اگر ان کا اپنا ذاتی یا کاروباری اور تجارتی نقصان بھی ہو جاتا تو وہ ان کو گوارا تھا، لیکن جمعیۃ علماء کے پروگرام سے خود کو الگ رکھنا، ان کے لیے ممکن نہیں تھا، اس کے علاوہ دیگر قومی وملی سرگرمیوں میں بھی وہ بقدر استطاعت ہمیشہ حصہ لیتے رہے۔

شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے زمرۂ مریدین میں تھے، اور کم عمری ہی میں ان سے بیعت ہو گئے تھے، ان کے انتقال کے بعد فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد مدنی نور اللہ مرقدہ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، اور ان کے جاں نثار لوگوں میں رہے۔

اللہ رب العزت ان کی بال بال مغفرت فرمائے، حسنات کو قبول فرمائے اور سیئات کو حسنات سے مبدّل فرمائے، اور کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، آمین ثم آمین۔